مَیں
ہُوں
خانہ
بدوش

دیوندر ستیارتھی کی دیگر کتابیں ـــــ

پنجابی :

گِدّھا

دِیوا بلے ساری رات

دھرتی دیاں واجاں (نظمیں)

کنگ پوش (افسانے)

شائع ہونے والی کتابیں ـــــ

اُردُو :

نئے دیوتا (افسانے)

ہندی :

گائے جا ہندوستان!

سانپ اور آدمی (افسانے)

انگریزی :

THE SINGING VOICE OF MOTHER INDIA

SONGS OF THE INDIAN PEOPLE

پنجابی :

تے ونجھلی وجدی رہی (نظمیں)

گاؤندا کسان

جنگلی کبوتر
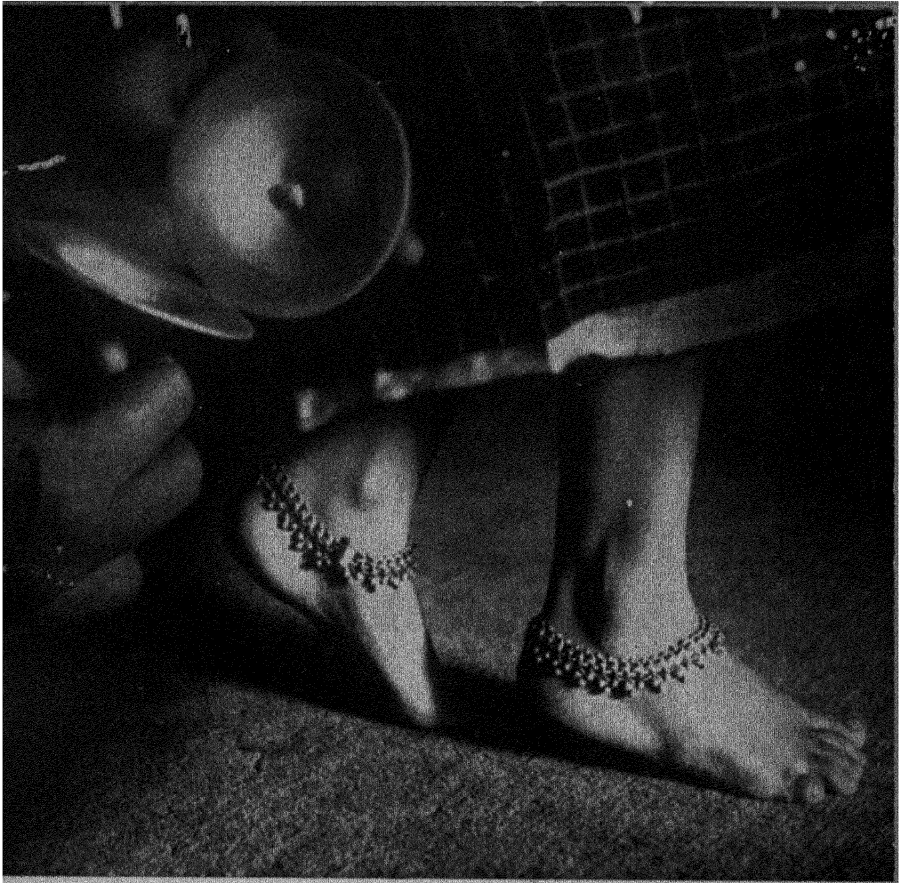
خانہ بدوش کنواری ناچتی ہے

میں ہوں خانہ بدوش

از

دیوندر ستیارتھی

لاہور
پنج دریا
نسبت روڈ

"۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ پروفیسر دیویندر ستیارتھی کو پُرجوش پرواز فکر کی خداداد قابلیت نصیب ہے۔ اسی کی بدولت وہ اپنا کام پوری توجہ اور تن دہی سے کر سکے ہیں کیونکہ اس کام میں انہوں نے حقیقی لطف محسوس کیا ہے۔

عوام کے نفس کا تخلیقی پہلو بھی ایک خاص دلچسپ الہام لئے رہتا ہے۔ اسے پوری طرح سمجھنے میں پروفیسر ستیارتھی نے ہماری مدد کی ہے۔ میں اُن کا ممنون ہوں۔"

رابندر ناتھ ٹیگور (ماڈرن ریویو، ستمبر ۱۹۲۷ء)

"۔۔۔۔ شری دیویندر ستیارتھی کی شاندار دھن کی بدولت میں اُن صوبوں کے دیہاتی گیتوں کے ممتاز مجموعے سے روشناس ہو سکا ہوں جن میں وہ گھومتے رہے ہیں۔ یہ گیت عوام کا ادب ہیں۔ ہمارے صوبوں کے درمیانی طبقوں کے لوگ جن سے کہ ان گیتوں کا تعلق ہے، ان سے بے بہرہ ہیں جیسے کہ خود گجرات میں ہم لوگ عوام کے گیتوں سے کورے ہیں۔"

ایم۔ کے گاندھی
(مسٹر کے۔ ایم منشی کے گجرات اور اُس کا ادب کے مقدمہ میں)

ناشر
مصنف

پرنٹر گوپال داس منیجر مرکنٹائل پریس لاہور

شانتی سُدھا کے نام

جس کا ساتھ پچھلے بارہ سال کی خانہ بدوشی میں
میری کٹھن منزلوں کو آسان کرتا رہا ہے۔

فہرست

مقدمہ از جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) ایڈیٹر ہمایوں لاہور ۷

اپنی بات ۱۷

دھرتی کے بیٹے ۲۹

میری زندگی کا ایک ورق ۴۱

برہمچاری ۵۳

تین گیت ۷۵

ہرنی ۸۹

دیا جلے ساری رات ۱۱۷

ایراوتی ۱۳۵

ماٹونشی [illegible]

ابھی کوتا سسرال نہ جائے گی ۱۶۹

اپنی جورو کو سمجھا ۱۷۷

وہ کسان شہزادی ۱۸۹

لالچی ۲۰۷

میں ہوں خانہ بدوش ۲۲۳

لنکا دیس ہے کولمبو ۲۳۷

جنگلی کبوتر ۲۵۵

"ظاہر ہے کہ پروفیسر دیویندر ستیارتھی کو پُرحس پرواز فکر کی خداداد قابلیت نصیب ہے۔ اسی کی بدولت وہ اپنا کام پوری توجہ اور تن دہی سے کر سکے ہیں، کیونکہ اس کام میں انہوں نے حقیقی لطف محسوس کیا ہے۔ عوام کے نفس کا تخلیقی پہلو بھی ایک خاص دلچسپ الہام لئے رہتا ہے۔ اُسے پوری طرح سمجھنے میں پروفیسر ستیارتھی نے ہماری مدد کی ہے۔ میں اُن کا ممنون ہوں۔"

رابندرا ناتھ ٹیگور

ماڈرن ریویو، ستمبر ۱۹۳۴ء

تقریباً پانچ چھ سال ہوئے اُن بد بسر دنوں کا زمانہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں "المنظر" میں اوپر اپنے کمرے میں میز پر کچھ لکھ پڑھ رہا تھا کہ ایک نوکر نے ایک چھوٹا سا پُرزہ میرے ہاتھ میں لاکر دیا۔ اُس پر لکھا تھا: "دیویندر ستیارتھی"۔ میں نے سوالی نظر سے نوکر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "جناب ایک لمبی داڑھی اور کھُلے بالوں والا فقیر صورت آدمی ہے"۔ فقیروں سے میری ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے لیکن پڑھے لکھے فقیروں سے کبھی کبھی مِل لیتا ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ مجھے اِس "فقیر" کی صورت پسند آئی۔ اُوپر بُلا لیا۔

وہی لمبی داڑھی، بڑی بڑی مونچھیں، لمبے لمبے کھُلے بال، روشن آنکھیں، بغل میں ایک بستہ دبائے، لمبا قد اور اُس پر ایک لمبا ہی سا کوٹ پہنے یوں ستیارتھی صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک ٹیگور نما آدمی میرے سامنے تھا۔ مجھے شانتی نکیتن یاد آگیا۔

ستیارتھی صاحب نے نرم نرم باتیں کرنی شروع کیں اور اپنے تھیلے میں سے جب "ماڈرن ریویو" اور "ایشیا" کے انگریزی پرچے نکالے اور اُن میں اپنے باتصویر گیتوں والے مضمون مجھے دکھائے اور سُنائے تو میں نے بالکل ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھ پر ان کا بہت رُعب پڑ گیا۔ میں اُنہیں اِس سے بھی اوپر کی منزل میں اپنی برساتی میں لے گیا۔ میں نے نوکر کو آواز دی، چائے منگوائی اور جی میں سوچا کہ آج کی شام ادبی عیش و عشرت میں گزارنی چاہیئے۔ ایک حقیقت نگار ادیب سے ملاقات ہوگئی اور وہ بھی بایں شکل و صورت! اُس روز سے لے کر آج تک میں نے بہت کوشش کی ہے کہ ستیارتھی صاحب کے مضامین کو تنقیدی نظر سے دیکھوں مگر سچ یہ ہے کہ کامیاب نہیں ہُوا۔ نقص دیکھنے کی ابتدا ہوتی ہے کہ اُن کی وہ ہلکی پتلی سی آواز، اُن کی وہ گھنی لمبی داڑھی، اُن کی وہ ساری ہیئت کذائی یاد آجاتی ہے اور میں پھر اُن کی تحریر سے محض لُطف اُٹھانے لگتا ہوں۔

لیکن انصاف کی نظر سے دیکھئے تو اُن کی تحریر ہے بھی پُر لطف۔ سیدھی سادی طرز، سیدھے سادے خیالات، پھر کِس طرح جو کہا ہے وہ دل میں جگہ نہ پالے؟

ستیارتھی صاحب کی عمر اِس وقت ۳۲ سال کی ہے۔ جا بجا بالوں کی کثرت نے خواہ مخواہ بزرگانہ شان پیدا کر دی ہے۔ یہ اٹھارہ سال کے تھے کہ نہ معلوم کیوں انہوں نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم انہیں سمجھا بجھا کر اگلی دنیا کے مضافات سے واپس یہاں لائے۔ بس واپس آنا تھا کہ بمصداق "ایک جگہ

نعرہ کہہ اُٹھتا ہے "کب بدلے گی سماج کی حالت؟" پھر لکھتا ہے:

"ایراوتی ہر نئے زمانے کا استقبال کرتی آئی ہے۔ وہ بہتی رہی ہے، بہنا ہی زندگی ہے۔ اُس میں طوفان بھی آئے ہیں، اور اب کے سماج میں بھی ایک بڑا طوفان آ کے رہے گا۔ گندی رجعت پسندی کی جڑیں اُکھڑ جائیں گی۔ کوڑا کرکٹ بہہ جائے گا، اور پھر شاید ایراوتی کے پانیوں پر لوگوں کے آنسو کبھی نہ گریں گے۔"

دیکھیں آپ نے اُدھر ایراوتی مصنف کو شانتی دیتی ہے" لیکن ادھر مصنف کو ایک طوفان اُٹھتا دکھائی دیتا ہے۔

برما کے لوگ ہندوستانیوں کی طرح مُردہ دل نہیں:

"جدھر نگاہ اُٹھاؤ ہنستے ہوئے چہرے۔ لوگ تو میں نے بہت دیکھے بھالے ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اِتنے خوش لوگ پہلے دیکھے بھی ہوں تو یاد نہیں آ رہا ہے۔ اِتنی بھی کیا خوشی ہے؟"

گویا ہندوستانی مصنف کے لئے اتنی خوشی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔

"صدیوں سے اس دیس کی عورت آزاد ہے۔ مرد نے اُس کی آزادی اور خوشی پر چھاپا نہیں مارا۔ اکثر وہ اپنے خاوند کی وفادار رہتی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"لنکا دیس" بھی ہندوستان سے مختلف ہے:

"اِدھر زندگی کا معیار ہندوستان کی اوسط درجے کی زندگی سے اُونچا ہے۔"

"اِدھر سہاگن اور بیوہ کی کوئی پہچان نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

اور اس فقرے نے مجھے بڑا مزا دیا:

"گشت کرتے ہوئے انگوروں کی طرح خوش پوش ٹینس مین ہر چیز کو گھورتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔"

شاید اِس "سادھو مصنف" کو بھی اُنہوں نے گھور کر دیکھا ہو، لیکن اب مئی ۱۹۴۷ء میں یہ کچھ ایسے سادھو نہ رہے تھے، چنانچہ اُنہوں نے لنکا والوں سے بھی خراج وصول کر لیا:

"اب میں کچھ اتنا غریب نہیں۔ کولمبو کے اخبارات سے مجھے اپنے مضامین کا معاوضہ ملنے لگا ہے۔"

سچ پوچھئے تو یہ سادگی پسند خانہ بدوش، سادھو کبھی تھا ہی نہیں۔ "برہمچاری" والے قصے میں "پنچ تنتر" کی کہانی سن لو۔ لیکن پچھلے اندرون[1] اور پیار بھی کسی ودیا سے سنتا نہیں۔ "آپ بیتی" لکھتے ہیں:

"میں سنبھل نہ سکا۔ جسم ہارتا جاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں اور اُس کے اُبھرے ہوئے گال۔ کیا یہ سب مایا ہے؟"

[1] دور جنگلوں میں پھول کھِل گئے۔

اَور بے دھڑک کہتے ہیں :

"اِس پیار سے خدا ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے۔ یہ بات تھی تو یہ صُورتیں نہ بنائی ہوتیں، یہ جذبات نہ دیئے ہوتے . . . . کیا برہمچریہ ہی سب سے اُونچی چیز ہے؟ کیا اِس کے لئے سب لُطف چھوڑ دینا چاہئے؟ یہ سب لطف جو خوبصورتی، گرمجوشی اور از خود رفتگی سے مِل کر بنا ہے؟"

واہ برہمچاری جی! "سچ ہے آدمی کتنا چھُپا رہتا ہے!" "جھلو" والی داستان میں بھی اِس رنگ کی جھلک ہے۔ اَیسا معلوم ہوتا ہے گویا "جوگی اُتر پہاڑوں آیا"[1] مصنّف دیکھنے کو بھولا بھالا ہے لیکن اُس کی نظر ہر طرف لگی رہتی ہے۔ شبہ ہونے لگتا ہے کہ چرخہ کاتنے والی دوشیزہ کے جنگلی کبوتر میں بھی آپ ہی کا جلوہ ہے: "جنگلی کبوتر نے مینوں تکھن وِچ اکھ ماری"[2]! "کناں کے خانے بڑا اج دے شوقین مُنڈے کھنڈ مکھ کے باگیاں لیندے"[3] والے نوجوانوں میں شاید "برہمچاری جی" بھی شامل ہوں! یعنی یہ "بودی والا تارا"[4] ایک عام چلتا پھرتا اِنسان ہے!

ہر شخص سے، ہر جانور سے، ہر چیز سے مصنّف کو جو محبت ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ تہذیب کے گرد سے، عوام سے لگاؤ ہے۔ اِسی لئے اِس مجموعے میں متمدن نظمیں نہ ملیں گی بلکہ عوام کے گیت اور وہ بھی دیہاتی گیت۔

"دھرتی کے بیٹے" کون ہیں؛ درخت!

"ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا ایک لطیف جذبہ قائم ہے اور یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا . . . بوڑھے برگد کی نگاہوں میں ایک ٹھوس سچائی بھری ہے۔ وہی سچائی جو محنت مشقت کے بعد چھاؤں میں بیٹھے ہوئے کسان اور مزدور کو صدیوں سے محسوس ہوتی رہی ہے . . . نہ تنہا آدمی بھلا نہ تنہا درخت۔

کلّی ہوئے نہ بناں وِچ ٹاہلی ، کلّا نہ ہووے پُت جٹ دا[5]!"

یہ مصنّف نرا شاعر ہی نہیں :

"زمین میں جکڑے ہوئے درختوں کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے۔"

ہرنی کی درد انگیز پکار سے مصنّف کی عمل پسندی جوش میں آ گئی ہے :

"ہمارے دیہاتی گیتوں میں ہرنی کی پکار نہ جانے کتنی صدیوں سے گونج رہی ہے۔ گاؤں کو ایسی بستی مت سمجھئے جہاں ایک سی عورتیں اور ایک سے مرد کسی نہ کسی طرح جلتی جاتی زندگی کے دن کاٹ کر چلتے بنتے ہیں۔ مصیبت میں سارا گاؤں مِل کر وقت سے مِل کر کروٹ بدلتا

[1] جوگی پہاڑ سے اُتر آیا۔
[2] چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں جنگلی کبوتر نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا!
[3] آج کل کے شوقین نوجوان محبوبہ کے گالوں پر کھانڈ لگا کر بوسے لیا کرتے ہیں!
[4] شہاب یا دُم دار تارا۔
[5] نہ شیشم کا درخت جنگل میں اکیلا ہو اور نہ کسی کسان کا بیٹا اکلوتا ہو۔

ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھوک اور غریبی مٹ جائیں اور گھر ہوئی آزادی پھر نصیب ہو جائے۔ ان پُر تحریک لمحوں میں ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق صرف قسمت پر شاکر رہنے کا مسئلہ پھیکا پڑنے لگتا ہے اور یہ خیال بھی کہ امیری اور غریبی کی حدیں سدا یونہی بنی رہیں گی، سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔"

وطن کی محبت ستیارتھی کے رگ و پے میں موجزن ہے:

"ہندوستان کے طول و عرض میں ہرنی کی پکار گونج رہی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کیا ہمارا وطن یونہی بے کس رہے گا؟ کیا ہماری قوم یونہی منہ لٹکاتی رہے گی؟ شکاری بھائی کب تک اس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ کب ناچے گی ہرنی خوشی میں آ کر؟"

"خانہ بدوش مصنف" کو عوام سے گہرا عشق ہے اور ہونا ہی تھا۔ ہمارے کسانوں کی زندگی جیسا کہ میکسم گورکی نے پرانے روس کے متعلق لکھا ہے "ایسی غریبی اور جہالت میں گزرتی ہے کہ غم ان کی تفریح کا ایک بہانہ بن جاتا ہے۔ دکھ اور بپتا سے وہ بچوں کی طرح کھیلتے ہیں اور اپنی تکلیف پر شرمندہ نہیں ہوتے۔" لیکن اس دکھ درد کا دوسرا پہلو بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ یوپی کے دیہات میں چماروں کی محفلوں میں گت گوند:

"جب ڈھولک بجنے لگتی ہے ساری فضا اس کی تھرکن پر ناچ اٹھتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہاں کوئی غربت باقی رہی ہے نہ کوئی غلاظت .... الاؤ کی سنہری روشنی میں کالے کلوٹے آدمی بھی کتنے بھلے دکھائی دیتے ہیں .... کتنے خوش ہیں یہ لوگ جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے سارے سپنے سچے ہو گئے ہوں۔ کتنا مذاق، کتنی چٹکیاں، کتنے قہقہے، کتنے لطیفے، یہ سب اس الاؤ کے شعلے ہیں جو ان کی دلی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔"

"خانہ بدوش مصنف" کہاں کہاں جاتا ہے۔ اس کے کان میں کوئی کہتا ہے "آؤ اور میرے ساتھ چلو" یہ کھلی آزاد ہواؤں کے لئے میرا دل ہمیشہ بے چین رہا ہے۔ ہوائیں سینہ اٹھائے گھومتی پھرتی ہیں .... اور مسافر چل پڑے۔ تو بھی چل۔ رات گئی دن آیا، دیکھ کہیں نہ پڑا رہ جائے بابا کا سایہ۔ ہواؤں کا یہ پیغام میں روز سنتا ہوں۔ میں ہوں خانہ بدوش .... ہمیشہ سڑک مجھ سے کہتی ہے ــــ چلو ابھی اور آگے چلو .... کبھی کسی دوست کا خط آ جاتا ہے تو زندگی اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے صرف دوست ہی کمائے ہیں ....

'پتا جی! ہم لنکا کب جائیں گے؟'

'چپ بیٹی ابھی پیسے تو آنے دو کہیں سے۔'

'کہاں سے پیسے آئیں گے؟'

'خدا بھیجے گا۔'

'ضرور؟'

'ہاں ضرور'
کوبتا ہنس رہی ہے 'اُس کی ماں بھی اور میں بھی'۔
آخری مضمون "جنگلی کبوتر" میں خانہ بدوش مصنف اپنے گاؤں کا کیسی سادہ اور لطیف زبان میں، ذکر چھیڑتا ہے:

"ماں کی گود کی طرح یہ گاؤں بار بار مجھے بلاتا ہے ۔ ۔ ۔ چاروں طرف کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ راس کماری تک چکر لگا آیا۔ اس سے بھی پرے لنکا میں بھی گھوم پھر آیا۔ مگر پاس کے یہ گاؤں میری نظر سے پرے رہے۔"

کتاب ان لفظوں کے ساتھ ختم ہوتی ہے:

"جنگلی کبوتر کی طرح جو آسمان کی وسعتوں کا دورہ کرنے کے بعد پھر دھرتی پر اترتا ہے میں بار بار یہاں چلا آتا ہوں۔ یہ ساری دھرتی مجھے جانتی ہے۔ یہاں میں نے جنم لیا۔ میرے سپنوں میں جو درجہ اسے حاصل ہے وہ کسی دوسرے کا حق نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ گاؤں ہمیشہ کے لئے مجھے جکڑ نہیں سکتا۔ غربت بھی ہے اور افسردگی بھی مگر دل کو خوش کرنے والے گیت بھی تو ہیں۔ تھکن اُتار دینے والے، ڈانواڈول روحوں کو خود فراموشی کے عالم میں لے جانے والے۔ یہ گیت ماضی کے بیٹے ہیں اور مستقبل کے امانت دار۔ سنتے جاؤ اور گاتے جاؤ اپنے گیت پرانے اور نئے دھرتی کے بیٹو!"

مصنف کے گاؤں کا نام نغمہ پسند کانوں کے لئے ذرا نامانوس ضرور ہے مگر حب وطنی کو منطق کی پروا نہیں۔ وہ اپنی سادگی و پرکاری سے سخت کو نرم اور کرخت کو شیریں بنا دیتی ہے۔ یہی کام ستیارتھی صاحب نے کیا ہے۔

کتاب کی تمہید یوں ہے:

"گھوم گھام کر میں ادبی دنیا کے کوچے میں ایک فقیر کی طرح اپنا کچکول لئے آ نکلا ہوں"۔

ستیارتھی صاحب اگر فقیر ہیں اور پیسہ پیسہ نظر تو کچھ ایسے ہی آتے ہیں، تو وہ بڑے مزے کے فقیر ہیں۔ بعض مجھ سے مصنف ہیں کہ اپنے کمرے کی میز ہی پر بیٹھ کر لکھنا چاہتے ہیں اور بعض "خانہ بدوش مصنف" سے ہیں کہ جب تک رامچندر جی کی طرح لنکا کا سفر نہ کر لیں ایک مختصر سا مضمون لکھنے کو بھی ہاتھ میں قلم نہیں اُٹھاتے۔ مزاج ہو تو ایسا!

میں اُوپر لکھ چکا ہوں کہ میں اس کتاب کو نقاد کی حیثیت سے دیکھنا نہیں چاہتا میں تو اس سے لطف اُٹھانا چاہتا ہوں۔ ستیارتھی صاحب اپنے خط میں مجھے لکھتے ہیں "میں صرف تعریف نہیں چاہتا۔ آشیرواد اور مشورہ کے بنا مقدمہ کا رنگ پھیکا ہی رہتا ہے"۔ مقدمہ پھیکا رہا ہو یا شوخ میں نے کتاب پڑھ کر لطف اُٹھا لیا اور جو لکھنا تھا لکھ دیا۔ ہاں مصنف کی تسلی کے لئے اتنا اور لکھ دیتا ہوں کہ بعض ہندی لفظوں نے بڑا مزا

دیا لیکن اگر "لاگو" اور "اپسرا" کے سے شبدوں کا دخل نہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔ البتہ حق یہ ہے کہ یہ دخل در معقولات ہے بہت کم۔ ایک اور بات کی بھی مجھے ذرا سی شکایت ہے۔ دیہاتی گیتوں میں ایسے گیتوں کو جگہ نہیں دی گئی جو عام فہم اُردو سے تعلق رکھتے ہوں۔ میرے ایک یو۔پی کے دوست نے بھی جنہیں میں نے اجنپانہ اور یو۔پی کے گیتوں کے مشمولہ نمونے سُنائے یہی شکایت ظاہر کی۔ اُمید ہے کہ اپنی کسی آئندہ تصنیف میں مصنف اس کمی کو پُورا کر دے گا۔

اس سلسلے میں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ستیارتھی صاحب فرقہ وارانہ تعصب سے پاک ہیں۔ چنانچہ اپنے مضمون "ہیر" کے اخیر میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا تقابلی مطالعہ بہت اہم ہے۔ اُن صوبوں میں بھی جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی زبان میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں کتنے ہی فارسی اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ بار بار مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ زبان کے متعلق ہمارا تعصب کسے سطحی اور بناوٹی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کسی لفظ کا استعمال نہیں کرتے کہ اُس کا حسب نسب، جنم استھان یا مذہب کیا ہے بلکہ ہر لفظ اُن کی زبان پر اُسی طرح آتا ہے جیسے دھرتی پر کوئی پودا اُگتا ہے۔"

اس سلسلے میں بعض اُن شیریں جملوں کا اعادہ کر دینا چاہتا ہوں جن سے میں نے خاص طور پر لطف اُٹھایا:

"شاعری کی زبان جذباتی فضا میں جنم لیتی ہے۔ لفظوں میں ایک قسم کا نیج سا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔" (مجھے گلہ کرنا چاہئے کہ ستیارتھی صاحب نے کبھی نہ مجھے گا کے سُنایا نہ ناچ کر دکھایا۔ "خانہ بدوش مصنف" ضرور ان فنوں سے واقف ہو گا۔)

"میبی کے سینے میں جیسے موتی پروان چڑھتا ہے گاؤں کے سینے میں گیت پلتے ہیں۔"

"عورت کو سطحی انداز سے دیکھنا کتنا آسان ہے۔ بہت کم ہیں جو اُس کا چہرہ نہیں دیکھتے دل دیکھتے ہیں۔"

"پہلے پہل پرندوں کے میٹھے بول سُن کر آدمی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ہو گی۔" اس سے مجھے ایمرسن کا وہ فقرہ یاد آگیا کہ "اگر ستارے دس ہزار برس تک صرف ایک رات نظر آتے تو انسان صدیوں اس منظر کو نہ بھولتا۔"

مصنف نے گیتوں پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"گیتوں کے جذبات اُن کی زبان سے کہیں زیادہ پُرانے ہوتے ہیں۔"

"گیت کا ترجمہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟ ...... ترجمے میں وہ خوبی نہیں پیدا کی جا سکتی جس سے دیہاتی موسیقی کا جادو ایک ایک لفظ میں جذبات کی تصویر کو زندہ کر دیتا ہے۔"

"یوں گیت تو سبھی اپنی اپنی جگہ دل کی سمٹی ہوئی دُنیا میں جذبات کی لہریں پیدا کر دیتے ہیں مگر غمناک گیتوں کی بات ہی کچھ اور ہے ...... زندگی میں غم ہے بھی زیادہ۔ تو غم کے گیت ہمیں کیوں نہ پسند آئیں؟"

"دیہاتی گیت بالکل سادہ ہوتے ہیں، اس لئے وہ تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں اور یہی عمدہ گیتوں کی شناخت ہے۔"

"پنجابی شعر و نغمہ کی زبان ہے۔ صدیوں سے پنجابی گیت زندہ ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب تک پنجاب کے میدانوں میں دریا بہتے ہیں، اس کے کھیتوں میں گیہوں اور باقی اناج پیدا ہوتے ہیں، اور جب تک 'تنجن' میں عورتیں باہم مل کر چرخہ کاتتی ہیں، یہ گیت مر نہیں سکتے۔"

"خدا کی عام صنعت کے بنیادی ترنم اپنی آپ بیتی سناکر ہمیں زندگی اور موت کے دوراہے پر لا پہنچاتے ہیں۔"

پنجابی گیتوں پر مصنف مست ہے اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی انہیں نے مزا دیا:

"چرخے دی گوکر سن کے، جوگی اتر پہاڑوں آیا۔"[1]

"میرا لے چل چرخہ اوتھے، اوے جتھے تیرے ہل وگدے۔"[2]

مجھے شبہ نہیں کہ "چرخہ" دراصل دیہاتی زندگی کے دو نہ بدست پنچھی ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ اپنی مادری بولی کے گیتوں ہی میں موسیقی سنائی دے سکتی ہے؛

"اُڈ نی چڑیئے، اُڈ وے کانواں
کونجاں کھیڈدے نال بھراواں"[3]

"کونتاں نی بی رانی
سوہریاں دے گھر جانی"[4]

"منڈے آپنے تھائیں رہندے
نی دھیاں کیوں بنائیاں رب نے!"[5]

"خانہ بدوش مصنف" کے گیتوں کی دُور دُور تشہیر و شہرت ہو چکی ہے۔ ہندی، اردو، پنجابی، انگریزی رسالوں میں اُن کے مضامین معاوضے پر چھپتے ہیں۔ امریکہ کے رسالے "ایشیا" نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ ہندوستان کی بیس زبانوں سے گیت جمع کر چکے ہیں اور ان گیتوں کا کئی بڑے بڑے آدمی سن چکے ہیں۔ ستیارتھی صاحب گھر بیٹھ کر دیہاتی گیت گانے کے قائل نہیں۔ وہ ایسے خانہ بدوش ہیں کہ غریب کی کوٹھڑی سامنے آجائے یا امیر کا محل، معمولی انسان راہ میں مل جائے یا کسی لیڈر کا پتہ چلے وہ ہر کہیں جا گھستے

---

[1] چرخہ کی گونج سن کر جوگی پہاڑ سے نیچے اُتر آیا۔
[2] میرا چرخہ وہاں لے چل جہاں تیرے ہل چل رہے ہیں۔
[3] اُڑ جا اے چڑیا، اُڑ جا اے کوے، کونجیں اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیل رہی ہے۔
[4] کونتاں بی بی رانی ہے۔ وہ سسرال میں جانے والی ہے۔
[5] لڑکے اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں۔ ہائے! خدا نے بیٹیوں کو کیوں جنم دیا؟

ہیں اور بستی بستی سے جا ملتے ہیں۔ معلوم نہیں اُنہوں نے کبھی اپنی نسبت یہ سوچا ہے کہ وہ بڑے "پرچارک" آدمی ہیں اور گویا ہر جگہ یہ صدا بلند کرتے سُنے گئے ہیں: "ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا۔ اور درویش کی صدا کیا ہے"؛ اور آجکل کے درویش کو ہونا بھی ایسا ہی آدمی چاہئے جیسے کہ وہ ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک بقچہ ہوتا ہے اُن کا کچکول۔ اُس میں "ایشیا"، "ماڈرن ریویو"، "ہمایوں"، "وشال بھارت"، "پھلواڑی" وغیرہ رسالوں کی فائلیں ہوتی ہیں جن میں اُن کے مضامین چھپ چکے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے متعلق آٹھ صفحات کا ایک اعلیٰ درجے کا پمفلٹ نکال دکھاتے ہیں جس کے سرورق پر اُن کی پُررعب شبیہ ہے۔ ایک صفحہ اُن کی خود نوشت سوانحعمری کے لئے وقف ہے۔ پھر ٹیگور، گاندھی، سروجنی نائیڈو، ایڈیٹر ماڈرن ریویو، سی۔ ایف۔ اینڈریوز وغیرہ سے ملاقات کا ذکر ہے اور اُن کے متعلق اِن بڑے آدمیوں کی رائیں۔

مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ مجھ سے "امیر ادیب" کی طرح ستیارتھی صاحب سے "فقیر" بھی اپنا کیمرہ رکھتے ہیں جس سے وہ مقامات اور اشخاص کو اپنے ساتھ شامل کر کے اُن کی تصویر اُتارتے اور پھر شائع کر دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں مشہور یا مشتہر ادیب۔ چھپنے چھپانے کی کیا بات ہے، تصویر منہ سے بولتی ہے۔ اب بے مستور رہتے ہوئے بھی منظورِ نظر بننے کا ڈھنگ اور کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مصنفین کے لئے اتنی خود پسندی بھی جائز نہ سمجھی جائے تو بیچارے کیا کریں؛

اس پمفلٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ ستیارتھی صاحب شروع شروع میں خدا کے فضل سے بلا ٹکٹ ریل کا سفر کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی فاقہ مستی تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ کیا کرتے؛ بنگال سے بمبئی اور کشمیر سے کوہاٹ تک کے متعدد دسواور زہید گاؤں گاؤں گھومنا یا کوئی بات چیت گفتگو کر سکتا ہے یا پھر حضرت ستیارتھی، جہاں انہیں بہت سی دقتوں کا سامنا ہوا ہے۔ وہاں بلاشبہ اُنہوں نے زندگی سے خاص لطف بھی اُٹھایا ہے اور مفید کام کر دکھایا ہے۔

ٹیگور لکھتے ہیں:

"ہم پروفیسر ستیارتھی کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے ہمیں عوام کے نفس کے تخلیقی پہلو سے روشناس کرایا ہے۔ . . ."

گاندھی جی کہتے ہیں:

"ہم شری ستیارتھی کے مؤثر استقلال کے مداح ہیں جس کی بدولت ہم عوام کے ادب سے روشناس ہوئے۔ . . ."

سروجنی نائیڈو کہتی ہیں:

"میں ستیارتھی کے کام کی دلدادہ ہوں۔ وہ ایک سادھو کی طرح گاؤں گاؤں جاتے ہیں اور ہندوستان کے وہ گیت جمع کرتے ہیں جن سے ہمیں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ساری نوعِ انسان درحقیقت

ایک ہی گھرانا ہے۔ بچّوں کی لوریاں اور چرخے کے گیت ایک دوسرے سے ہزاروں میل دُور ملکوں میں بھی ایک دوسرے سے کس قدر ملتے جُلتے ہیں . . . .

مئی ۱۹۴۰ء میں جب ہمارا مصنّف مدراس پہنچا تو مسٹر راج گوپال اچاریہ نے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

"پروفیسر ستیارتھی ہمارے عوام کی ذکاوت کے علَم بردار ہیں اور مَیں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان بھر میں اُن کے ساتھ کا دوسرا آدمی موجود نہیں۔ اُن کا عشق حبّ الوطنی سے بھی بلند تر ہے۔ عوام لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن گیت گانا خوب جانتے ہیں۔ خیال سے راگ تک صرف ایک چھلانگ درکار ہے۔ یہ ہے دیہاتی گیتوں کا حُسن۔ ہماری یونیورسٹیوں کو ستیارتھی صاحب کی مدد کرنی چاہیے . . . .

غرض ہمارے "خانہ بدوش مصنّف" نے صرف دیہاتوں میں آوارہ گردی نہیں کی بلکہ شہروں میں بھی اپنا جال پھیلایا ہے۔ پچھلے دنوں مَیں یہ مقدمہ لکھنے کو تھا کہ میرے بیٹے منظر بشیر نے ۲۲ جون ۱۹۶۱ء کے ٹائمز آف انڈیا کے ہفتہ وار باتصویر ایڈیشن میں مجھے انعامی تصویروں میں ایک تصویر لا دکھائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ستیارتھی صاحب جلوہ گر ہیں۔ کسی مدراسی نے "پری کو شیشے میں اُتار کر" جو تصویر اخبار میں بھیجی تو فوراً "زائد انعام" پالیا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہے "ستیارتھی"۔ یہ ہے بھارت کا "گیت منگا" خانہ بدوش مصنّف! مَیں انہیں ایک دوست کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

کراچی ۲۸ جون ۱۹۶۱ء

بشیر احمد

اپنی بات

گھوم گھام کر میں ادبی دُنیا کے کوچے میں ایک فقیر کی طرح اپنا
کچکول لئے ہوئے آنکلا ہوں۔ اس میں میری اپنی تسلّی بھی شامل ہے
جس کے بغیر میرا قدم اُس آرام سے نہیں اُٹھ سکتا جس سے کہ میں
صحیح معنوں میں لطف اُٹھا سکوں۔ اس سڑک پر میں اکیلا نہیں ہوں
مگر اکثر اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ آگے کون کون نکل گیا اور پیچھے کون
کون آ رہا ہے۔ دائیں بائیں ساتھ ساتھ چلنے والوں سے بھی میری
پوری واقفیت نہیں۔

وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کے گیتوں کی طرف میرا دلی
میلان کس طرح ہوا۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بچپن میں اپنے گاؤں ہی
میں یہ شوق پیدا ہو گیا تھا جب کہ بیسیوں گیت میرے ذہن میں جڑ
پکڑتے چلے گئے تھے۔ انہیں قلم بند کرنے کا خیال ۱۹۲۴ء کے آخری

دنوں میں پیدا ہُوا - اور مَیں نے پنجابی گیتوں کا مجموعہ تیار کرنا شروع کر دیا۔
یہ شوق، جس کی ابتدا محض ایک شغل کی صورت میں ہوئی تھی، پھر اتنا بڑھا کہ ۱۹۲۷ء میں کالج سے مُنہ موڑ کر بغیر بہت سوچے سمجھے یا کوئی منصوبہ باندھے بے سروسامانی کی حالت ہی میں مَیں نے خانہ بدوشی اختیار کر لی۔ اُن دنوں کسے خبر تھی کہ اتنے لمبے عرصے تک یہ شوق قائم رہ سکے گا۔
آج سے تینتیس سال پیشتر، جب کہ روس رجعت پسندی کے تاریک اور غمناک دَور میں سے گزر رہا تھا، میکسم گورکی نے اپنے ایک مضمون میں پیشینگوئی کی تھی :۔

"عوام میں مادی برکتوں کو ہی پیدا کرنے کی قوت نہیں ہوتی وہ روحانی برکتوں کو بھی جنم دیتے ہیں۔ وہ اُس ماں کی طرح ہوتے ہیں، جس کی گود سدا ہری رہتی ہے۔ وہی دُنیا کے پہلے فلسفی ہیں اور وہی پہلے شاعر بھی۔ دُنیا کی بہترین شاعری، المیہ ناٹک اور ان سے بھی اعلےٰ چیز یعنی دُنیا کی تہذیب کی تاریخ، ان سب کی تخلیق اُنہی نے کی ہے۔ بچاؤ کے خیال نے انہیں اُبھارا اور زندگی کے ابتدائی دَور میں خالی ہاتھوں ہی وہ قدرت سے بھڑ گئے۔ ڈر، حیرانی اور خوشی سے متاثر ہو کر اُنہوں نے مذہب کو جنم دیا۔ یہی مذہب اُن کا شعر و نغمہ تھا، اور اسی میں

قدرت کی طاقت کے متعلق اُن کا سارا علم اور تجربہ، جو باہر کی طاقتوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اُنہیں حاصل ہوا، پوشیدہ تھا۔

"قدرت پر اپنی پہلی فتح سے دھرتی کا بیٹا خوددار بنا، اُسے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ اور اس کے بعد نئی فتح کا شوق سمایا۔ اِسی نے پھر اُسے بہادروں کی کہانیاں گانے پر مجبور کیا جو کہ اُس کے علم اور طرزِ عمل کا مجموعہ بن گئیں، کیونکہ لوگوں نے اپنا مجموعی علم دے کر کبھی اپنے کسی بہادر سردار کو دیوتاؤں کے ساتھ ایک قطار میں اور کبھی اُن کے بالمقابل کھڑا کیا۔ روایتوں اور بہادروں کے گیتوں سے، جیسا کہ اُن کی زبان سے بھی، ہمیں کسی اکیلے آدمی کا نہیں بلکہ لوگوں کی مجموعی تخلیق کا پتہ چلتا ہے۔"[1]

اُن دنوں گورکی کا خیال ایک پروگرام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ لوگوں کے نسل در نسل چلے آنے والے زباں زد گیت اور کہانیاں اُن کی مجموعی قوتِ ارادی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اپنی خانہ بدوشی کے دَوران میں اُس نے مختلف رُوسی لوگوں کے گیتوں اور کہانیوں میں ایک زبردست اُمید کی جھلک دیکھ لی تھی اور اس کے ساتھ ہی اُس نے

[1] "شخصیت کی بربادی" ـــــ گورکی (۱۹۰۸ء)

لوگوں کے سینوں میں یہ یقین بھی پا لیا تھا کہ انسان کا مستقبل روشن ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ کبھی کسان اور مزدور فتحیاب نہ ہوں۔ ادب کے اس ترقی پسند پہلو نے اُس وقت تک بلند پایہ رُوسی ادب میں بھی اتنی جڑ نہ پکڑی تھی۔ اُس نے سوچا ہو گا کہ جب یاس اور غلامی میں جکڑے رہ کر بھی یعنی بُرژوا جماعت کی پیدا کی ہوئی حالتوں میں بھی، دیہاتی گیت اور کہانیاں زندہ رہ سکتے ہیں تو مزدوروں کے آزاد مُلک میں تو لوگوں کے اِس قومی ادب کی گہرائی، فنی زدپ اور اوج کئی گُنا شاندار ہو اُٹھیں گے۔

تعجب تو یہ ہے کہ گورکی کا خیال، جو کہ میری پیدائش سے ایک سال پیشتر رُوس کے ادبی ماحول میں گونج اُٹھا تھا، اٹھارہ سال کی عمر تک بھی، جب کہ میں پہلے پہل گھر چھوڑ کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا تھا اور جس وقت کی ایک ذہنی تصویر "برہمچاری" میں محفوظ ہے، مجھ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

اب دیکھتا ہوں کہ اُس وقت مجھے دیہاتی گیتوں کی قومی اہمیت کا بالکل پتا نہ تھا۔ نہ ہی میں نے سوچا تھا کہ مجھے اُن پر مضامین لکھنے ہوں گے جس سڑک پر میں چل پڑا تھا، اُس کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ یہ جاننے کی میں نے پروا ہی نہ کی تھی۔

لاہور میں چند پٹھان نوجوانوں سے میری آشنائی ہو گئی تھی۔ وہ پشتو گیت سُنا کر اُن کا مطلب سمجھایا کرتے اور میں دیکھا کرتا کہ پنجابی اور پشتو گیتوں

کے جذبات کیسے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح ایک کشمیری دوست کی زبانی کشمیر کے گیت سُننے کا موقع ملا۔ پنجابی اور کشمیری گیتوں کی یگانگی بھی صاف ظاہر تھی۔ ہر زبان کے گیت جمع کروں، یہ خیال پختہ ہوتا گیا۔ اور شاید غیر شعوری طور پر یہ بھی خیال رہا کہ اِن گیتوں کا بالمقابل مطالعہ بہت دلچسپ رہے گا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ شروع میں گیتوں سے کہیں زیادہ ایک قسم کی آوارگی کے خیال نے ہی مجھے گھر چھوڑنے کے لئے اُبھارا تھا۔ اِسی لئے پہلے مَیں نے کشمیر کو چُنا جس کی خوبصورتی کا چرچا مَیں نے بہت سُن رکھا تھا۔

میرے مضامین پہلے ہندی رسالوں میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ پھر مَیں نے اُردو، انگریزی اور پنجابی میں بھی لکھنا شروع کیا[1]۔ اُردو میں میرا

[1] مضامین ہندی میں "وشال بھارت"، "ہندی سندیش"، "سُدھا"، "ناگری پرچارنی پتر کا"، "وشو متر"، "ہنس"، "ہندوستانی"، "ہندی پرچار سماچار (مدراس)" اور "سادھنا" وغیرہ میں ــــ انگریزی میں "امرت بازار پترکا"، "ماڈرن ریویو"، "کشمیر رپری انڈیا"، "ٹربیون"، "دی کنٹری وُمین (لندن)"، "دی انڈین پی۔ ای۔ این"، "جنرل آف دی آندھرا ہسٹوریکل سوسائٹی"، "رورل انڈیا"، "انڈین ریویو"، "دی نیو ریویو"، "دی آرین پاتھ"، "دی ہندو (مدراس)"، "دی سیلون ڈیلی نیوز"، "دی سیلون آبزرور"، "دی ٹائمز آف سیلون" اور مشہور امریکن رسالہ "ایشیا" میں ــــ اور پنجابی میں "دیش درپن"، "پریت لڑی"، "پھلواڑی"، "لکھاری"، اور "پنج دریا" وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں ..... پنجابی میں میری کتاب "گِدھا" جس میں ہردلعزیز پنجابی دیہاتی ناچ اور اُس کے گیتوں پر بحث کی گئی ہے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور دو اور کتابیں "گاؤنداکسان" اور "دیوا بلے ساری رات" اِس سال شائع ہو رہی ہیں۔

پہلا مضمون "ہندوستان کے دیہاتی گیت" "چندن"[1] میں شائع ہوا۔ اِس میں مَیں نے لکھا تھا: —

"...... کالی داس کے متعلق جو کہانی مشہور ہے، اُسے دُرست مان لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وُہ بھی کسی دیہاتی ماں کا ہی نُورِ چشم تھا...... جو گیت اُس نے چرواہے کا کام کرتے ہوئے گائے ہوں گے اُن کا کچھ نہ کچھ اثر تو اُس کی مشہورِ عالم شاعری پر بھی ضرور پڑا ہوگا...... اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم دیہاتی گیتوں کو جو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں، اکٹھا کر کے سنبھال کر رکھیں۔ یہ گیت ہر قوم کے ادب کی شان کو دوبالا کر سکتے ہیں، ...... پڑھے لکھے لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دیہاتی گیتوں کو نگاہِ محبت سے دیکھتے ہیں۔ مگر ہماری بناوٹی شہری تہذیب اور مذاق اُڑانے کی ذہنیت اُنہیں ایسا کرنے سے روکتی رہتی ہے خوشی کی بات ہے کہ اب لوگ دیہاتی گدڑیوں میں چھپے ہوئے لعلوں کو پرکھنے کے لئے بے قرار دکھائی دیتے ہیں......"

جن دنوں میں پٹھانوں کے گیت جمع کر رہا تھا، پشاور کے "سفیرِ سخن"[2] میں میرا ایک مضمون شائع ہوا۔ میں نے لکھا تھا:

[1] فروری ۱۹۳۳ء [2] مارچ ۱۹۳۵ء

غیر ممالک میں دیہاتی گیت بڑی بھاری تعداد میں جمع کیے گئے ہیں اور ادیبوں نے اُنہیں خاص طور پر مُرتّب کر کے ضخیم مجموعوں میں شائع کیا ہے، وہاں کی یونیورسٹیوں میں ان گیتوں کے بہترین اور چیدہ وچیدہ انتخاب کورس کی شکل میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے مُلک میں اس قسم کی سعی اور قدر دانی نفی کے برابر ہے...... گیتوں کے آئینے میں ہم اپنے مُلک کی رُوح دیکھ سکتے ہیں... ضرورت ہے ایسے اصحاب کی جو ہندوستان بھر کے دیہات میں گھوم گھوم کر نہایت صبر و استقلال سے مختلف زبانوں کے گیت جمع کریں اور اُنہیں مع ترجموں کے کتابی شکل میں مرتّب کر کے دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہ صرف دُنیا کے لٹریچر ہی کی عظیم خدمت نہ ہوگی بلکہ ہندوستان کے قومی لٹریچر کی تعمیری بُنیاد کا کام دے گی......"

پھر 'ادبی دُنیا'[1] میں "ہمارے دیہاتی گیت" شائع ہُوا۔ میں نے لکھا تھا:

"...... اپنے دیہاتی برادرانِ وطن سے بہت دُور ہم شہروں میں آ بسے ہیں اور کبھی بھول کر بھی اُس خلیج کو پُر کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو ہمارے شہروں اور دیہات کے مابین

[1] مئی ۱۹۳۶ء

روز بروز وسیع ہوتی چلی جارہی ہے۔ دیہاتی گیتوں کا مطالعہ ہمیں
اُس پُل کا کام دے سکتا ہے جو ہمیں دوبارہ اپنے وطن کی دیہاتی
دُنیا تک پہنچنے میں مدد دے سکے ...."

اُردو میں میرے مضامین اکثر 'ہمایوں' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کی بھی یک کہانی ہے۔ ۱۹۳۵ء کے سالگرہ نمبر میں عبدالرحمٰن چغتائی کے آرٹ کا ایک سہ رنگا نمونہ 'دیہاتی لڑکی' کے عنوان سے شائع ہوا تھا ــــ "دیہاتی لڑکی اپنے خیالات میں گُم، اپنی راہ کی پروا کئے بغیر اپنی دُھن میں جارہی ہے۔ درختوں کے جُھکے ہوئے سر بھی اُس کی حیرانی کی تصدیق کر رہے ہیں۔ گویا مصوّر نے کائنات کو لڑکی کا ہم نوا بنا لیا ہے۔ تصویر کا ہر خط اور رنگ اُس کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے"۔ اِس نوٹ کے علاوہ ایڈیٹر ہمایوں نے تصویر سے متاثر ہوکر اپنے جذبات کی یوں ترجمانی کی تھی:

"اَے ہندوستان! تیرے بہتے دریا سے اپنی گاگر بھر کر وہ تیرے پیپل تلے آکھڑی ہے۔ وُہ جس کا دِل صدیوں سے اپنے شوہر اور اپنے بچّوں کے لئے دھڑکتا رہا ہے۔ وہ جس پر اُس کے شوہر اور اُس کے بچّوں نے صدیوں ہی ظلم و ستم بھی توڑے۔ اُس کی گاگر بس آج کل میں ٹوٹنے والی ہے!

" وہ دریا، وہ بہتا پانی، وہ گھریلو دیوی، وہ مٹّی کی گاگر ان سب

کا دور ہو چکا۔ اب تو لوہے کے نل ہیں اور موٹر کار اور ڈھکے کانوں اور منڈی بھووں والی انگریزی بولتی ہوئی نازک تیمیں! اب تو پیپل کے پیڑوں کی فقط تصویریں ہیں۔

"نہیں نہیں۔ یہ حال وہاں ہے جہاں قصبے پھیل کر شہر بن گئے ہیں، جہاں شہر فولادی پٹڑیوں کی باہیں پھیلا کر ایک دوسرے کے گلے ملنے کی فضول کوشش میں ہانپ رہے ہیں کہ وہاں دریا ہیں تو گدلے۔ اور پیپل ہیں تو ناپاک، اور عورتیں ہیں تو بجائے گاگر سر پر تولے بھاری بھرکم کتابوں سے لدی پھرتی ——

لیکن وہاں اے ہندوستان! جہاں تیرے وسیع میدانوں میں دریا بہتے ہیں۔ اسی شان، اسی آن بان کے ساتھ جہاں ہوائیں کبھی تیز کبھی مدھم، اب بھی پیپل کے پتّوں سے سرسراتی ہوئی گزرتی ہیں۔ وہاں اے پیارے وطن! اے دلدادۂ رنج و محن! وہاں اب بھی اپنی اپنی گاگر کو سر پر سنبھالے ایک نہیں، دو نہیں، بیسیوں وہ سادہ دل، جفاکش ہستیاں تیری پگڈنڈیوں پر صبح و شام آتی جاتی ہیں جن سے میدانوں کی آرائش اور زمین و آسمان کی زیبائش ہے، اے میرے مجبور و مقہور وطن!

"سو اُن کو اے وطن! جو تیری بیڑیاں کاٹنے کو شہروں

میں غُل مچاتے پھرتے ہیں، اُن کو اِن سرسبز و شاداب ویرانوں کی
طرف بُلا، جا اُنہیں یہاں کھینچ لا یہاں، جہاں نہ بندش ہے، نہ
غلامی؛ جہاں نہ کالے ہیں نہ گورے، جہاں صبح کے سنہری تخت پر
بادشاہ نہیں بیٹھتے، بلکہ ننھی چڑیاں کھیلتی ہیں، جہاں دریاؤں کے
اُوپر پُل نہیں بندھتے بلکہ جہاں اُن کے کناروں پر قدرت اپنی
پیاسی مخلوق کو خود چُلّو بھر بھر کر تازہ پانی پلاتی اور مسکراتی ہے،
اے میرے ہزاروں نعمتوں سے مالامال وطن!"

مَیں نے سوچا کہ یہ شخص، جو دیہاتی لڑکی کے متعلق اِن گہرے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے، دیہاتی گیتوں کے متعلق بھی بہت ترقی پسند رائے رکھتا ہوگا۔ اور جب مَیں خود میاں بشیر احمد سے ملا تو میرا خیال ٹھیک نکلا۔ "ہمایوں" کے جائنٹ ایڈیٹر حامد علی خاں صاحب نے بھی میرے کام کو قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔ اِس ادارے سے مجھے ہمیشہ وہ خلوص ملتا رہا ہے جس کا تعلق مضامین سے کہیں زیادہ خود میری ذات سے ہو گیا ہے۔ اور مَیں بے حد احسان مند ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ اِس کتاب کا مقدمہ میاں بشیر احمد صاحب لکھ رہے ہیں۔ پانچ سال پہلے، جب مَیں اُن سے ملا تھا کسے خبر تھی کہ میری پہلی اُردو کتاب کا تعارف بھی اُنہیں کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

سوائے چند مضامین کے، جو پہلے پنجابی یا ہندی میں لکھے گئے تھے،

باقی سب براہِ راست اُردو میں لکھے گئے ہیں اور کتابی صُورت میں پہلی بار دُنیائے ادب کے سامنے آ رہے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو کتاب شایع ہونے سے چند ہفتے پیشتر ہی لکھے گئے۔

'دھرتی کے بیٹے' ترقی پسند ہندوستانی ادب کے مجموعے "نئے زاویے" کے لئے جسے کرشن چندر ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے، لکھا گیا تھا۔ 'لاچی'، 'جنگلی کبوتر' اور 'لنکا دیس ہے کولمبو' بالترتیب "ادبِ لطیف"، "ادبی دنیا" اور "ساقی" کے لئے لکھے گئے تھے۔ اُنہیں یہاں دوبارہ شایع کرتے ہوئے مَیں اِن اِداروں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہُوں۔

لاہور، ۷ مارچ ۱۹۴۱ء

دیویندر ستیارتھی

۱

دھرتی کے بیٹے

بچپن کی خوشیاں، جن کے نشانات میرے دل پر اب بھی باقی ہیں، ہمارے اِس برڑ کے درخت کو بھی یاد ہوں گی۔ کسی دِن یہ درخت جوان تھا اور اس کے جذبات کسی کسان دُولھا کے میٹھے سپنوں سے بھی دلکش تھے۔ اُن دنوں شاید اِس کی چھاؤں، اتنی گھنی نہ تھی۔ مگر جہاں تک میری یاد کا تعلق ہے میں نے اسے بڑھاپے کے دَور سے ہی گزرتے دیکھا ہے کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں، اس کی ہئیت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی اُس روز ہوگی، جب میں پہلی بار اِس کی چھاؤں میں آبیٹھا تھا۔

روز بروز، لمحہ بہ لمحہ اِس درخت نے راہگیروں کی گفتگو سُنی ہے۔ وُہ

خاموش ہے ضرور مگر اُسے دیہاتی زندگی کے سینکڑوں واقعات کا پتہ ہے۔
سینکڑوں جاڑوں، گرمیوں اور برساتوں کی کہانیاں، امیری غریبی کی کشمکش،
ان گنت جھگڑے اور تماشے ـــــ ان سب نے اُس کے سینے پر بے حد
لطیف نشانات چھوڑے ہیں۔ اس کے نیچے کا کچا چبوترہ، جو اب نصف سے
زیادہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور جس کے متعلق ٹھنڈی چھاؤں کا مزا لینے والے
چرواہے اور کسان نوجوان اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، پہلے
بہت خوبصورت تھا۔ یہاں بیٹھ کر میں نے بارہا اس درخت کے کانپتے
ہوئے پتوں کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا تھا۔ کئی بار تو میں اس کے تنے سے
اِس طرح لپٹ گیا تھا جیسے اپنے معصوم ہاتھ پھیلا کر میں اپنے باپ کی ٹانگوں
سے جا لپٹتا تھا۔

ہمارے گاؤں کی تاریخ کے ساتھ اِس بوڑھے بڑ کا یہ اٹوٹ رشتہ کسی
خاص تشریح کا محتاج نہیں۔ ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار
کا ایک لطیف جذبہ قائم ہے اور یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ درخت تو
ہمارے گاؤں کے چاروں طرف بیسیوں نہیں، سینکڑوں ہیں مگر جو اطمینان
مجھے اِس بوڑھے بڑ کے نیچے بیٹھ کر حاصل ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔ بعض
اوقات تو میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ وُہ گہرا سانس لے رہا ہے اور راہگیروں
کی طرف سے نگاہیں پھیر کر میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں ایک

ٹھوس سچائی بھری ہے ـــــ وہی سچائی جو محنت مشقت کے بعد چھاؤں میں بیٹھے ہوئے کسان اور مزدور کو صدیوں سے محسوس ہوتی رہی ہے۔

یہ درخت یہاں نہ ہوتا تو قریب کا یہ نہر کا پُل بالکل بے رونق ہوتا۔ نہر سرہند کی یہ شاخ، جس پر سیر کرنے کے لئے میں خوشی خوشی چلا آتا ہوں، بہت پُرانی نہیں۔ اِسے اِدھر آئے چالیس سال ہوئے ہوں گے۔ جب کُھدائی کا کام ہو رہا تھا، مزدوروں اور مزدور عورتوں کی پسینے سے تر پیشانیاں دیکھ کر، اُن کے ہنسی مذاق اور گالی گلوچ کو سُن کر، اور اُن کے پوشیدہ جذبات میں انسانیت کا بُنیادی احساس پا کر یہ بڑ بہت محظوظ ہُوا ہوگا۔ اور پھر جب اِس پُل کی تعمیر شرُوع ہوئی تھی تو ٹھیکیدار اور سرکاری انجنیروں کے درمیان رشوت کا رشتہ دیکھ کر تہذیب اور سرمایہ داری کی حقیقت بھی اُس پر خُوب واضح ہوگئی ہو گی۔

"زمین میں جکڑے ہوئے درخت چلنے کی خواہش کرتے ہیں ......
اور اِنسان ایک ایسے سُورگ کی آرزو میں سرگرداں ہے، جہاں سے ٹکٹ دھاری دیوتا بھی رِہا ہونے کے لئے بیتاب ہیں!" ـــــ پھر تری ہری لکھ گئے ہیں۔ کیا ہمارا یہ بُوڑھا بڑ بھی چلنے کی خواہش کر رہا ہے؟ ایسی اچھی جگہ اِسے اُور کہاں مِلے گی؟

وہ ایک راہگیر جا رہا ہے۔ بُڑھاپے کی وجہ سے بیچارے کا جسم ٹھٹھر

رہا ہے۔ وہ ذرا رُک کیوں نہیں جاتا؟ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ”آ جاؤ، سردار جی! ذرا سستا لو۔“

میری آواز راہگیر تک نہیں پہنچی۔ وہ چلا گیا۔ دُور بہت دور۔ بوڑھا بڑ خاموش کھڑا ہے۔

مَیں بھی تو سپنوں کے قلعے بنا رہا ہوں۔ چاہتا ہوں دُور اُفق کے پاس جا پہنچوں، جہاں سپنوں کی پریاں لوریاں گا رہی ہیں! بوڑھا بڑ خاموش کھڑا ہے۔ شاید وہ کہنا چاہتا ہے ”دیکھ کس طرح اپنے بازو پھیلا رکھے ہیں، مَیں نے تیرے اِردگرد! کیا میری چھاؤں کی لوریاں سُندر نہیں؟“

جب تک یہ بڑ یہاں کھڑا ہے تب تک یہ آہستہ آہستہ ہر ایک کے کان میں کہتا ہے ”محبت اور عظمت ایک ہی حسینہ کے دو رخسار ہیں!“ مَیں اسے چھوڑنے کا نہیں۔ ٹکٹکی لگا کر مَیں اس کی چوٹی کی طرف دیکھتا ہوں۔

درخت کی خاموش محبت میں وہ غلط فہمیاں کہاں جو آدمی کی دُنیا میں قدم قدم پر عیاں ہیں؟

۲

”ٹُٹ گئے تریل دے موتی

پیلاں پوندی دے!“

— اوس کے موتی ٹوٹ گئے جبکہ میں مورنی کی طرح ناچ رہی تھی!

کوئی کسان دوشیزہ گاتی جارہی ہے۔ اپنے سنہری رتھ پر سوار سورج دیوتا بوڑھے بڑ کے اوپر آگیا ہے۔ چوٹی کے پتے جگ مگ جگ مگ کر اُٹھے۔ پنجابی زبان کا یہ نغمہ سینکڑوں سال سے دلوں کا سفر کرتا آرہا ہے۔

"رات نے سورج سے کہا 'تم چاند کی معرفت پیار کے خط بھیجا کرتے ہو۔ میں اُن کا جواب اوس کی شکل میں گھاس پر چھوڑ جاتی ہوں!'" ٹیگور نے لکھا ہے۔ دیہاتی لڑکی یہ جانتی تو اوس کے موتی یوں اپنے قدموں تلے نہ توڑ دیتی۔ بوڑھا بڑ شاید دھرتی کی اس بیٹی کو پکار پکار کر کہنا چاہتا ہے "تم نے اوس کے موتی کیوں توڑے؟"

یہ لو، دو بچے چلے آرہے ہیں۔ گھر پر ماں باپ گھُرکیاں دیتے ہیں۔ مگر بوڑھے بڑ کے پاس صرف خاموش محبت ہے، جو اُن کے ذہن میں گڑتی چلی جارہی ہے۔ سورج کی طرف مُنہ کیے وہ گارہے ہیں:

"سورجا! مورجا!!
جھگا دیوُں، ٹوپی دیوُں،
تیڑ نوں لنگوٹی دیوُں،
کراری دُھپ کڈھ دے!"

— 'او سورج مورج! میں تمہیں قمیص دوں گا، ٹوپی دوں گا، اور کمر کے لئے لنگوٹی دوں گا۔ تیز دھوپ نکال دے!'

بچوں کی کلکاریاں سُن کر بُوڑھے بڑ کی خاموشی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ سینکڑوں بچے باری باری یہاں آتے ہیں۔ ”چھوٹے بچوں کو میرے پاس آنے دو، بہشت کی حکمت ایسی ہی ہے!“ — مسیح کا یہ قول میرے ذہن میں گونج اُٹھتا ہے۔ سکول ماسٹر بچوں کو ڈانٹ کر کہتا ہے ”سبق کیوں نہیں یاد کیا؛ بُوڑھے بڑ کے تلے چھلانگیں مارنے سے کیا حاصل؟“ بچوں کو یہ ہدایت بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ صدیوں سے وہ سُورج کے لئے قمیض، ٹوپی اور لنگوٹی کا پیشکش لئے حاضر رہے ہیں۔ شرط یہی ہے کہ وہ جاڑے میں ذرا تیز چمکے اور بچوں کے اِردگرد اپنی گرم کرنوں کا جال بُن دے۔

بُوڑھا بڑ ایک مست شاعر کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ کسانوں کے نغموں کا وُہ پُرانا سرپرست ہے۔ دھرتی کے بیٹوں کی امیری غریبی کا وہ چشم دید گواہ ہے۔ شاید وُہ اُن کے دلوں کی باتیں بھی بھانپ جاتا ہے۔

”پِپّل گاوے، بوہڑ گاوے
گاوے ہریالا تُوت
کھڑ کے سُن، راہیا!
تیری رُوح ہو جُوگی سُوت!“

— ”پیپل گا رہا ہے، بڑ گا رہا ہے، سرسبز شہتوت بھی گا رہا ہے کھڑا ہو کر سُن، او راہی، تیری رُوح کو سکون نصیب ہو جائے گا۔“

"برچھاں دے گیت سُن کے
میرے دل وِچ چانن ہویا!"

— 'درختوں کے گیت سُن کر میرے دل میں روشنی ہو گئی'۔

مست ہوا میں، جادو بھری فضا میں، جب بسنت کی دیوی للچائی ہوئی نگاہوں سے ایک ایک درخت اور پیڑ پودے کی طرف جھومتی اٹھلاتی چلی آتی ہے، دھرتی کی رگ رگ میں مدھ بھری اپنائیت سما جاتا ہے۔ خود فراموشی کے عالم میں شاید ہر ایک درخت کچھ نہ کچھ گنگناتا ہے۔ پُرسکون لمحوں میں پتوں کی معمولی سی سرسراہٹ سُن کر بھی راہگیر پر اکثر درخت کی دلی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔ درختوں کی صحبت میں اُن کی حسّاس سرسراہٹ سے متاثر ہو کر آدمی ہمیشہ دھرتی کے دل کا بھید پا لیتا ہے۔

نہ تنہا آدمی بھلا، نہ تنہا درخت۔ گاؤں کا شاعر ہمیشہ اپنی دعائیں دیتا آیا ہے:-

"کلّی ہووے نہ بنّاں وِچ ٹاہلی
کلّا نہ ہووے پُت جٹ دا!"

— 'خدا کرے شیشم کا درخت بھی جنگل میں اکیلا نہ ہو اور نہ کسی کسان کا بیٹا اکلوتا ہو'۔

"بیریاں نوں بیر لگ دے
تینوں کجھ نہ لگا مٹیارے!"

—' بیر کے درختوں پر پھل آتا ہے۔ اری دوشیزہ تجھے کوئی پھل نہ لگا!'

"رُت یاریاں لون دی آئی
بیریاں دے بیر پک گئے!"

—' اب وہ رُت آگئی جب آپس میں محبتیں پیدا ہوں گی۔ بیر یوں کے بیر پک گئے!'

'میتوں کلی نوں چبارہ پادے
روہی والا جنڈ وڈھ کے!"

—' میرے لئے الگ چوبارہ بنوا دو۔ بیابان میں جو جنڈ کا پیڑ کھڑا ہے، اُسے کاٹ کر شہتیر بنالیں گے!'

'بیہڑے لا ترونیں
چھاویں بہہ کے کتیا کروں"

—' آنگن میں ایک ساتھ تین درخت لگاؤ، ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر میں چرخہ کاتا کروں گی!'

'مقرنیاں باہجھ نہ سوہندے پپل
نخلاں باہجھ کھُلا ہیاں
ہتاں نال عیلاں سوہندیاں
بنداں نال گھرائیاں

دھن بھاگ میرے آکھے پپل
کڑیاں نے پینگھاں پائیاں
ساون وچ کڑیاں نے
پینگھاں اسمان چڑھائیاں!"

— نہ چبوتروں کے بغیر پیپل سہاونے معلوم ہوتے ہیں، نہ پھولوں کے بغیر پھلاہی کے پیڑ۔ ہنس کے ساتھ عمیل[ؔ] بھلی لگتی ہے اور بنؔد کے ساتھ گجراؔئی۔ پیپل کہہ رہا ہے۔ 'میری خوش قسمتی ہے کہ نوجوان لڑکیوں نے مجھ پر جھولے ڈالے ہیں۔ ساون میں لڑکیوں نے اپنے جھولے آسمان کی طرف بڑھانے شروع کر دیئے۔

'برچھا! برچھا! طوطا بریا—
'اکّے تیری نرمی بھیڑی
اکّے تیرا اُنڈھ پرانا!'
'نہ میری نرمی بھیڑی
نہ میرا اُنڈھ پرانا
اکّے کھادا نواب دیاں ڈاچیاں
اکّے شتیر کپ کھڑے ترکھاناں

سلہ ناگہ زیورات کے نام۔

"میرا بھی"

ہمیشہ سے آدمی اور درخت کے درمیان پیار کا لطیف جذبہ قائم ہے، اور یہ رشتہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ زمین میں جکڑے ہوئے درختوں کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے، کبھی تیز رفتار سے، کبھی آہستہ آہستہ — آدمی کے لہو کی طرح۔

ہمارے بوڑھے بڑ کی جڑیں دھرتی کی نبض پہچانتی ہیں۔

کتنی لا انتہا ہے زندگی کی وسعت! آدمی اور درخت دونوں دھرتی کے بیٹے ہیں۔

بوڑھا بڑ ایک جہاں دیدہ اور ذی حس دانا کی طرح کھڑا ہمارے گاؤں کو تک رہا ہے۔

۲

میری زندگی کا ایک ورق

ہمارے گھر میں جب بھی کسی کی موت واقع ہوتی، میری آنکھوں سے آنسو نہ گرتے۔ سب مجھے پتھر دل خیال کرتے۔ مگر اپنے اُس دوست کی موت نے جیسے برسوں کے جمع کیے ہوئے آنسو اُنڈیل دیئے۔

دیہاتی ناچ کا ایک گیت، جو میں نے اپنے گاؤں میں سنا تھا، میں نے اُسے کئی بار سنایا تھا— "قبراں اُڈیک دیاں، جیوں پُتراں نوں ماواں!" یعنی قبریں انتظار کر رہی ہیں جیسے مائیں بیٹوں کی راہ دیکھا کرتی ہیں)! اور ماں کے ساتھ قبر کی اس تشبیہ کی تعریف کرتے ہوئے میں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ یہ ایک بے مثال خیال ہے اور دُنیا کے ادب میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا، حالانکہ یہ وُہ بھی جانتا تھا کہ میں یُوں ہی جذبات کے زیرِ اثر

یہ بات کہہ رہا تھا۔

جس دن اُس کی موت کی خبر پہنچی مجھے فوراً اُس گیت کا خیال آیا، اور میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ اُس نے کبھی کھُل کر یہ کیوں نہیں بتا دیا تھا کہ وہ قبر کو اپنی حقیقی ماں سے کہیں بڑھ کر سمجھنے لگا ہے اور جلد اُس کی گود میں جا سوئے گا۔

اُس کا گھر قصور میں تھا۔ ہم مہندرا کالج پٹیالہ میں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے۔ سنگیت میں اُسے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے شہر کے کسی گویے سے اُس نے کئی پکے راگ سیکھ رکھے تھے۔ اصرار کرنے پر وہ اکثر کوئی چیز گا سُناتا۔ اُس نے اچھا گلا پایا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آواز بنسری کی لَے سے مل کر بنی ہے۔ جب وہ کلاونت کی طرح راگ کی الاپ شروع کرتا تو میں ہنسی نہ روک سکتا۔ سوچتا کہ یہ صرف راگ ہی نہیں ہے۔ بلکہ گلے کے ساتھ کشتی لڑنے کا مظاہرہ بھی ہے۔ ایک دو بار میں نے اپنی طنز ظاہر بھی کی۔ اِس کا جواب اُس کے پاس ایک ہی تھا۔ تُم پکّے راگ کی اہمیت کیا جانو، تمہیں تو گنواروں کے گیت ہی پسند ہیں!

گرمی کی چھٹیوں کے بعد کالج میں آیا تو پتہ چلا کہ وہ ابھی نہیں لوٹا۔ گھر پر بیمار ہے، اور پھر معلوم ہوا کہ اُس نے کالج بدل لیا ہے اور اب لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی کالج کا طالب علم ہے۔

مجھے بھی قبض رہنے لگا۔ یا یہ کہئے کہ میں سمجھنے لگا کہ مجھے قبض رہنا چاہیئے!
میرا رنگ کچھ کچھ زرد ہونے لگا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا اور دل میں
کہتا کچھ کچھ زرد تو ہو چلا ہوں۔ اگر گھر جا کر پتا جی سے کہہ دوں کہ پٹیالہ کا پانی
مجھے راس نہیں اور لاہور جانے کے لئے اصرار کروں تو شاید میں بھی
ڈی۔اے۔وی کالج میں داخل ہو جاؤں۔

پتا جی نے خرچ بڑھ جانے کا مسئلہ چھیڑا مگر میں نے ایک نہ مانی۔
وہ میری ضد سے واقف تھے۔ پھر جب کالج بدلنے پر پتہ چلا کہ وُہ لڑکا
بدستور بیمار رہنے اور ابھی گھر سے نہیں لوٹا تو ایک عجب بے کلی سی رہنے
لگی۔ اور جب موت کی خبر پہنچی تو میری رُوح پر ایک بوجھ سا آ پڑا۔

پڑھائی میں میرا جی نہ لگتا تھا۔ کالج میں پہلی دلچسپیاں موجود تھیں
مگر وہ سب رونق مجھے بے جان معلوم ہوتی تھی۔ میرے کمرے میں اب
پہلی سی صفائی بھی نہ رہی تھی۔ کئی ماہ اسی طرح گزر گئے۔

کبھی کبھی میں پنجابی شاعری کا وُہ عام ٹکڑا جسے میں نے پہلے پہل ایک
میراثی چھوکرے کی زبانی سُنا تھا، گنگنانے لگتا:

"عقل کہے میں سب توں وڈی، وچ کچہری لڑدی
شکل کہے میں تیتھوں وڈی، میرا دنیا پانی بھردی
دولت آکھے تنہوں دی وڈی میں نہیں کسے توں ڈردی

مَوت کہے تسیں تینے جھوٹھیاں مَیں جو چاہاں سو کردی!

— عقل کہتی ہے — مَیں سب سے بڑی ہوں مَیں کچہری میں بحث کرتی ہوں۔ خوبصورتی کہتی ہے — مَیں تجھ سے بھی بڑی ہوں۔ دُنیا میری غلام ہے۔ دولت کہتی ہے — مَیں تجھ سے بھی بڑی ہوں۔ مَیں کسی سے ڈرتی نہیں۔ مَوت کہتی ہے — تم تینوں جھوٹ بولتی ہو۔ مَیں جو چاہوں وُہی کروں؛

مَیں کالج جاتا ضرور مگر صرف وقت کاٹنے کے لئے۔ پڑھائی تو پڑھائی، مجھے تو اُن دنوں زندگی ہی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ بے معنی ہی نہیں بے ربط بھی۔ مَوت کا راز کیا ہے؟ بُدھ نے اِس کے متعلق کتنا سوچا تھا۔ اور اُس کے پیرو تو کہتے ہیں کہ اُس نے اسے پا لیا تھا مگر مَوت سے تو وہ بھی نہ بچ سکا پھر وُہ مَوت کا راز آخر تھا کیا جسے اُس نے پا لیا تھا؟

امتحان میں مَیں اُس سال پاس ہو گیا۔ یہ کچھ خوشی نہ تھی۔ کبھی سوچتا کہ کالج چھوڑ کر بھاگ جاؤں اور آوارہ ہو کر مُلک کا کونہ کونہ چھان ماروں۔ زندگی کی یہ سب ذمّہ داریاں کیوں اتنی ضروری مان لی گئی ہیں؟ اور پھر ایک دن مَوت آتی ہے، اور وہ سب پیالیاں، جن میں آدمی رنگ گھولتا ہے اور اپنی عُمر کا بیشتر حِصّہ خرچ کر ڈالتا ہے، اپنے حلق میں اُنڈیل لیتی ہے! جیسے زندگی کا سب رَس سُوکھ گیا ہو، مَیں ہنس نہ سکتا تھا۔ آنکھ سے دیکھتا کم، دل سے سوچتا زیادہ۔ اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ زندگی اِک اُلجھن کے سوا

کچھ نہیں ... جو لوگ خودکشی کر لیتے ہیں یہی ثبوت دیتے ہیں نا کہ انھوں نے اس جال میں پھنسے رہنا منظور نہیں کیا ..... وُہ کیا بُرا کرتے ہیں؟ ..... اور اگر مَیں بھی خودکشی کر لُوں ...

شرارتی لڑکوں کی چیخیں مجھے سرے سے ناپسند تھیں۔ نیند کے دھارے میں بھی یہ چیخیں مجھ تک پہنچتیں اور مَیں اُن کی طرف سے کان بند کر لینا چاہتا۔ دُنیا میں کتنے بچّے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ آخر کس لیے؟ یوں کالج میں آ کر چیخیں مار مار کر وہ کیوں کسی بھلے مانس کے کان کھا ڈالتے ہیں! ٹیگور کا وہ خیال کہ جب بھی کوئی بچّہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ پیغام لاتا ہے کہ ابھی تک خدا دُنیا کی تخلیق سے مایوس نہیں، میرے ذہن میں گونج اُٹھتا۔ کب مایوس ہوگا خُدا؟ اور کیا خُدا سچ مُچ کہیں ہے بھی؟ اکثر مجھے بڑے بوڑھوں کا وہ طنز آمیز نقرہ یاد آتا جو وہ بچپن میں کچھ اس طرح کی شرارتیں کرنے والوں پر کسا کرتے تھے — کیوں بے! پیدا ہُوا تھا یا یُوں ہی دھرتی سے اُگ آیا تھا؟ اور پھر مجھے کالج کے شرارتی لڑکوں پر ترس آنے لگتا۔ وہ ناسمجھ ہیں۔ سمجھ آ جائے سہی ... اُن میں سے بھی ایسے بیسیوں لڑکے نکل آئیں گے جو میری طرح خودکشی کا خیال پُختہ کر لیں .....

یہ ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے:

مَیں نیلا گنبد کے چوک میں آ کھڑا ہُوا۔ اب یہاں گھما گھمی نہ تھی۔ رات

نے خاموش ماں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور میں اس ماں کی موجودگی میں خودکشی پر غور کر رہا تھا ۔۔۔ راوی میں جا کودوں یا ریل کے انجن تلے سر کٹوا دوں، سر ہی نہیں بند بند؟ ..... اور رات چپ تھی۔

انارکلی کی طرف سے ایک نوجوان آتا دکھائی دیا۔ وہ میرے پاس سے گزر گیا۔ مگر پھر لوٹ آیا۔ جیسے اس نے میرا راز بھانپ لیا ہو۔

بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"تو بھی؟"

"اپنا کوئی دوست نہیں غمگسار نہیں۔"

"میں تو ہوں۔"

اس کی بڑی اور روشن آنکھوں میں میں نے انسانی ہمدردی کی جھلک دیکھ لی۔ اس کی آواز نے بھی مجھ پر اثر کیا۔ اس کا لباس میری طرح سادہ تھا۔

وہ بولا "میرے ساتھ چلو گے؟"

میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جیسے اس نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا تھا۔ راستے میں وہ پہلے خاموش رہا۔ پھر اس نے پوچھا "آخر تم اتنے اداس کیوں ہو؟"

"میرے دل میں بہت پریشانی رہتی ہے۔ میں اس زندگی کے کچھ معنی نہیں سمجھتا اور میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کھیل ختم کر ڈالوں

سائیکل کھڑا کر کے وہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ جیسے وہ میرے خیال کی داد دے رہا ہو اور خود بھی کسی دن خودکشی کرنے والا ہو۔

ہم آگے بڑھے۔ خاموشی نے ہم دونوں کے ہونٹ سی دیئے۔ وہ کون تھا، یہ میں نے اب تک نہ پوچھا تھا۔ میں کون ہوں، اُس نے بھی تو یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ ہم صرف دو آدمی تھے بغیر کسی لیبل کے۔

اُس وقت وہ میرا مرحوم دوست بھی آ ملتا تو شاید مجھے پہچان نہ پاتا۔ میں ایک نیا آدمی تھا۔

چلتے چلتے ہم میکلوڈ روڈ پر جا پہنچے۔ یہ سڑک میں نے بیسیوں بار دیکھی تھی۔ اُس خاموشی میں وہ کتنی متین تھی، کتنی پُرسکون۔ وہ نوجوان آگے آگے جا رہا تھا اور میں اُس کے پیچھے پیچھے۔

ہم ایک مکان میں داخل ہوئے۔ یہ کس کا گھر تھا، مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ اُس نے مجھے برآمدے میں ایک بنچ پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود اندر چلا گیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ ایک بزرگ صورت آدمی کے ہمراہ باہر آیا۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آداب بجا لایا۔

میں کہاں ہوں؟ کس کے سامنے کھڑا ہوں؟ یہ سوالات اُس وقت میرے دل میں جگہ نہ پا سکے۔ میں صرف ایک آدمی تھا۔ اور میرے سامنے

دو آدمی بیٹھے تھے جن میں سے ایک کو، جو بزرگ صورت تھا، آداب بجالانے میں میں حق بجانب تھا۔

نوجوان نے اس بزرگ کو میری حالت بتا دی ہو گی۔ یہ میں سمجھ گیا۔ میں گھبرایا نہیں۔ میرے ماحول کا سب سے ضروری سوال تھا موت کا راز۔ میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے بغیر زندگی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے متعلق مجھ میں ایسے بیسیوں تاثرات اُٹھتے رہتے تھے جنہوں نے سچ مچ مجھے دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ موت کے بعد بھی زندگی کا سلسلہ ٹوٹتا تھوڑا ہو گا۔ اور اس کے بعد کی حالت اس موجودہ حالت سے اچھی ہی ہو گی..... اور اگر نہ ہو تو بھی کونسا گھاٹا پڑ جائے گا؟..... اور میرا فیصلہ جھٹ خودکشی کے حق میں اور بھی پختہ ہو جاتا۔

وُہ بزرگ بولا "اچھا تو تم خودکشی کرنے جا رہے تھے؟"

"ہاں، صاحب!"

اس کے بعد وُہ چُپ ہو گیا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا، میں کچھ نہ جانتا تھا۔ میں چپ بیٹھا تھا اور وہ نوجوان بھی اُس بزرگ کی بغل میں چُپ بیٹھا تھا۔

وہ بزرگ پھر میری طرف مخاطب ہوا "اچھا تو تم خودکشی کا اِرادہ اَب بھی رکھتے ہو؟"

میں چُپ رہا۔ جیسے میں کوئی مُجرم تھا۔ حوصلہ کر کے میں نے دھیرے

سے کہا: "کچھ کچھ"

وہ مسکرایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں سچ مچ ایک مجرم ہوں۔ اور یہ صرف اُس کی عظمت ہے کہ میرے تھپڑ مارنے کی بجائے وہ صرف مسکرا رہا ہے۔

پھر وہ بولا: "تمہارا مذہب؟"

میں چپ تھا۔ میں مذہب کی قید میں نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ طالب علم کی زندگی کے لئے مذہب کے قافیہ اور ردیف کی چنداں ضرورت نہیں۔

اُس نے کہا: "تم کچھ جواب نہ دو گے تو میں تمہیں اپنی بات کیسے سمجھاؤں گا؟ ہاں تو بتلاؤ کہ تم مسلمان ہو، ہندو یا عیسائی؟"

میں نے بتایا کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔

"تو تم مسئلہ تناسخ میں تو یقین رکھتے ہو؟"

"کچھ کچھ"

وہ پھر چپ ہو گیا۔ میں اُس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سمجھا کہ میں کسی خضر کے سامنے بیٹھا ہوں اور وہ میری رہنمائی کرنے چلا ہے۔ دل میں اب پہلی سی بے کلی نہ تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ میری زندگی کا ایک اچھا دن ہے۔

وہ بولا: "اس مسئلہ کے مطابق مرنے کے بعد تمہاری تین حالتیں ہو سکتی ہیں

یہاں وہ ذرا رک گیا۔ میں نے سوچا۔ یہ آدمی ضرور ایک بڑا عالم ہے اور اس کے قدموں میں یوں بیٹھ کر زندگی اور موت کا گہرا راز پا لینا میرے لئے ایک فخر کی بات ہے۔

"۔۔۔۔ یا تو تم اس صورت سے بہتر صورت پا سکتے ہو۔ یا بالکل ایسی ہی۔۔۔۔ اور یا پھر اس سے بھی خراب۔۔۔۔"

میں دھیان سے سن رہا تھا۔

"۔۔۔۔ تو گویا بہتر زندگی پانے کی ایک تہائی امید ہی رہ جاتی ہے۔۔۔۔ اور پھر خودکشی کی تکلیف!۔۔۔۔ نہیں، بھائی، نہیں۔۔۔۔ اس تھوڑی سی موہوم امید پر میں تو کبھی مرنا پسند نہ کروں۔۔۔۔"

میں ایک نیا آدمی بن گیا۔

اب میں مجرم نہ تھا۔ اس بزرگ نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں جینا چاہتا تھا۔ موت کے بعد زندگی کے متعلق میرے شکوک و شبہات بیدار ہو گئے۔

آداب بجا لا کر میں نے اجازت لی۔ وہ نوجوان مجھے دروازے تک پہنچانے آیا۔ میں نے احسان مندانہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ اور آہستہ سے اس نے میرے کان میں کہا "آپ شاعر اقبال ہیں![1]"

[1] "کوئی بات ہو جس میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام آجائے روح میں ایک لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر ان کی زندگی کا کوئی واقعہ جس میں گویا وہ سامنے کھڑے یا بیٹھے ہوئے باتیں کرتے

دکھائی دیں اُن لوگوں کے لئے جنہیں اُن کی ملاقات کا شرف حاصل تھا، ایک بڑی آسمانی نعمت ہے۔

جب دیوندر ستیارتھی صاحب نے مجھے یہ واقعہ سُنایا، مجھے وُہ دن یاد آ گئے جب مجھے بھی یہ فخر حاصل تھا کہ کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کی صُحبت سے فیض پاؤں۔

ہر شخص کے لئے، بڑے آدمیوں کے لئے، گمنام آدمیوں کے لئے، اُن کا دروازہ ہر ایک کے لئے کُھلا رہتا تھا۔ جو اس دروازے سے واپس آتا، دل میں ایک دولت لے کر واپس آتا۔ ستیارتھی صاحب کا یہ ننھا افسانہ سُنئے اور حقیقت کو رُوبرو دیکھ لیجئے!"

"ہمایوں" اپریل ۱۹۴۱ء

بشیر احمد

۳

برہمچاری

ترینج ترنی کی وہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی، نہ پہلے کبھی پڑاؤ پر سورج کماری نے اتنا سنگار کیا تھا، نہ پہلے وہ گیس کا لیمپ جلایا گیا تھا۔ اِس روشنی میں سورج کماری کا عروسی لباس کتنا بھڑکیلا نظر آتا تھا۔

دونوں گھوڑے والوں کو خاص طور پر بُلایا گیا تھا۔ ایک کا نام تھا سوبزا اور دوسرے کا فتح۔ جے چند کا کشمیری کلرک جیالال بہت مسرور نظر آتا تھا۔ خود جے چند بھی دُولھا بنا بیٹھا تھا۔ رسوئیے کو نہ جانے اس محفل میں کچھ کشش کیوں نہ محسوس ہوئی۔ کام سے فارغ ہوا تو یار کا بازار دیکھنے چلا گیا۔

پریم ناتھ سے بغیر کچھ کہے سُنے ہی جب میں سری نگر سے پیدل ہی پہلگام کے لئے چل دیا تھا، تب کسے خبر تھی کہ اتنے اچھے خیمے میں جگہ مل جائے گی۔ سُورج کماری نے میرا بھید پالیا تھا۔ اُس نے جے چند کو بتا دیا کہ میں گھر والوں کی رضا مندی کے بغیر ہی اِدھر چلا آیا ہوں۔ اِس طرح اُس نے میرے لئے اپنے خاوند کی ہمدردی اُور بھی اُبھار دی۔

جیالال نے عزیزاں سے وہ گیت گانے کا مطالبہ کیا جس میں ایک کنواری کہتی ہے ـــ "بید مُشک کی خوشبو میرے من میں بس گئی ہے۔ باورے بھونرے! تُو کہاں جا سویا ہے؟" اُسے یہ گیت یاد نہ تھا۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ وُہ لڑکی جس کے من میں بید مُشک کی خوشبو بس گئی تھی، سُورج کماری سے کہیں بڑھ کر سُندر ہوگی۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کشمیر کی بیٹی کو اکثر بہت خوبصورت لباس نصیب نہیں ہوتا۔

خود سُورج کماری نہ جانے کیا سوچ رہی تھی، مجھے اُس کا وہ رُوپ یاد آ رہا تھا جب وہ ہرا دوپٹّہ اوڑھے گھوڑے پر سوار تھی اور چندن واڑی پار کر کے برف کے اُس پُل پر اُتر پڑی تھی جس کے نیچے سے شیش ناگ بہہ رہا تھا۔ تب وہ جنگل کی اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ راستے میں جنگلی پھُول چُن کر چلتے چلتے جیالال نے ایک گجرا تیار کر لیا تھا اور وُہ مُسکراہٹ مجھے کبھی نہ بھُولے گی جو کہ جیالال سے یہ گجرا لیتے ہوئے سُورج کماری

کی آنکھوں میں رقص کرنے لگی تھی۔

میں نے کہا "گیت تیار کرنا بہت مشکل کام تھوڑا ہی ہے۔ الفاظ کو بنسری میں سے گزار دو، گیت ہو جائے گا۔"

سورج کماری بولی "میرے پاس تو پرانے الفاظ بھی نہیں رہ گئے۔ ہاں بنسری میں نے سنبھال کر رکھ چھوڑی ہے ..... کبھی مجھے بھی شعر و نغمہ کی دُھن لگی تھی۔"

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن اپنے ذہن میں اس سے مخاطب ہُوا۔ گھبرا نہیں، مدہوش دلھن، تیرے بول تو بہت سریلے ہیں..... وہ ضرور کسی دن پھر بھی بنسری میں سے گزریں گے.... اور اپنے گیتوں میں تو مجھے بھول تو نہ جائے گی.....

عزیزا نے لوچدار آواز میں گانا شروع کیا:

"لچ پھلے اندونن
چ کنن گوئے نامے ادن؟
لچ پھلے کول سرن
وو تھونیرن کھس وو
پھولی بوسمن اندونن
چ کنن گوئے نامے اون؟"

—دُور جنگلوں میں پھُول کھِل گئے۔ کیا میری بات، تیرے کانوں تک نہیں پہنچی؟ کول سر جیسی جھیلوں میں پھُول کھِل گئے۔ اُٹھو ہم چراگاہوں کی طرف چڑھیں گے۔ دُور جنگلوں میں چنبیلی کے پھُول کھِل گئے۔ کیا میری بات تیرے کانوں تک نہیں پہنچی؟"

جے چند کشمیری خوب سمجھتا تھا۔ کشمیر میں ٹھیکیداری کرتے اُسے کئی سال ہو گئے تھے۔ سُورج کماری نے کبھی اس زبان میں دلچسپی نہ لی تھی، اس بات پر سب سے زیادہ حیرت مجھے اُسی رات ہوئی۔ جے چند بولا "یہ کسی کنواری کا گیت ہے۔ اُس نے دیکھا کہ بہار آ گئی۔ چنبیلی کے پھُول بھی کھِل گئے۔ اور پھر شاید غیر شعوری طور پر اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ خود بھی چنبیلی کا ایک پھُول ہے۔"

گیت کا ایک ہی ریلا عزیزا کو میرے قریب کھینچ لایا۔ سارے راستے میں کبھی مَیں نے اُسے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ آدمی کتنا چھُپا رہتا ہے۔ اُسے جاننے کی مَیں نے اب تک کوشش بھی تو نہ کی تھی۔

روز روز کے لمبے سفر سے ہم بہت تھک گئے تھے۔ اب اِس شغل میں سب تھکاوٹ بھُول گئی۔ سُورج کماری کا سُندر چہرہ سامنے نہ ہوتا تو عزیزا کو بہار کا گیت نہ یاد آیا ہوتا۔

سُورج کماری کہہ رہی تھی "بابُوجی! مَیں نے سُنا ہے کہ اِس وادی میں

بہنے والی پانچوں ندیوں کا پانی، جو اتنا قریب قریب بہتا ہے، ایک دوسری سے کم و بیش ٹھنڈا ہے۔"

جے چند بولا، "شاید یہ ٹھیک ہو۔"

مَیں سوچنے لگا کہ سب مرد بھی تو ایک سی طبیعت کے مالک نہیں ہوتے ... عورتیں بھی طبیعت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتیں ..... واہ ری قدرت، پنج ترنی کی پانچوں ندیوں کا پانی بھی یکساں ٹھنڈا نہیں!

"پاربتی اِن ندیوں میں باری باری سے نہایا کرتی تھی، بابوجی!"

"تم سے کس نے کہا؟"

"جیالال نے"

جیالال چونک پڑا۔ سورج کماری نے ہمیشہ طلب ہنسی ہنس کر جے چند کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ خود بھی ایک پاربتی ہو، اور اپنے شو کو رجھانے کا جتن کر رہی ہو۔

مَیں نے عزیزا سے کوئی دوسرا گیت گانے کا مطالبہ کیا۔ وہ گا رہا تھا:

"دنی دسی آروِلن یارگنی مے لکھنا؛
چھوہ لوگم مس وِلن یارگنی مے لکھنا؛
دمئی سئیند زیینی یارگنی مے لکھنا؛"

— آرول کے پھولوں میں تمہیں تلاش کروں گی۔ کہیں تم ملو گے

نہیں (میرے) محبوب؛ میرے بال بال کو خود سے نفرت ہو گئی ہے۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب؛ سندھ نالے کے پانیوں پر تمہیں تلاش کروں گی۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب؛'

رفیع اُس درخت کی طرح تھا، جسے جھنجوڑنے پر اونچی ٹہنی پر لگا ہوا پھل نیچے نہیں گرتا۔ اُس نے ایک بھی گیت نہ سنایا۔ لیکن جیالال کافی اُچھل پڑا اور بغیر رسمی تقاضے کے اُس نے گانا شروع کیا:

"چوری یار چولم تائے، تہی ماڈے ادھے وون؛
تہی ماڈے ادھے وون؛
دُورن مارن گرائے لولو، گرائے لولو!
وبھی وی وگ نیا و رود ہائے کرونے
سنگر مالن چھائے لولو۔ چھائے لولو!"

—'میرا محبوب چوری چوری بھاگ گیا۔ کیا تم نے اُسے دیکھا ہے کہیں، دیکھا ہے کہیں؛— کان کے سبزے ہلاتے ہوئے، ہلاتے ہوئے! اُٹھو پریو! ہم "رود" ناچ ناچیں گے، پہاڑیوں کی چھاؤں میں، چھاؤں میں!'

جیالال مسکرا رہا تھا۔ شاید خود ہی اپنے گیت پر خوش ہو رہا تھا۔ سُورج کماری کی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنا بے کار نہ رہا۔ وہ

اُس کی زبان نہ سمجھتی تھی، داد نہ دے سکتی تھی۔ لیکن اُسے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

سُورج کماری کی مسکراہٹ میں کتنی موہنی تھی۔ وہ کالی داس کی کسی حُسن و عشق کی نظم کی طرح تھی جس میں الفاظ ایک سے زیادہ معنی پا اُٹھتے ہیں۔ چنانچہ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اس کی مسکراہٹ جے چند اور جیالال کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے ہے۔

مگر مَیں اس مایا میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اپنشد کی پُرانی کہانی "کچ دیویانی" میری آنکھوں کے آگے پھر گئی ـــ سُورج کماری شاید دیویانی تھی اور مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں بھی کسی کچ سے کم نہیں۔

اُپنشد کا کچ سوُرگ کا رہنے والا تھا۔ مَیں اسی دھرتی کا۔ یہی فرق تھا۔ وہ دھرتی پر ایک رِشی کے آشرم میں زندۂ جاوید رہنے کی وِدیا سیکھنے آیا تھا، اور مَیں نے یاترا کے دن کاٹنے کے لئے جے چند کے خیمے میں پناہ لی تھی۔ سُورگ سے چلتے وقت کچ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ وِدیا سیکھ کر واپس سُورگ میں لوٹنا اور وہاں کے باسیوں کو اس کا فیض پہنچانا کبھی نہ بھولے گا۔ اس کے لئے سب سے ضروری یہی تھا کہ وہ برہمچاری[1] کے دھرم پر برقرار رہے۔ رِشی کسی کو یہ وِدیا آسانی سے

[1] پاک باز کنوارا

سکھاتا نہ تھا۔ کتنے ہی نوجوان اُس سے پہلے بھی آ چکے تھے۔ ہر کوئی رشی کے غصے کی تاب نہ لا کر وہیں ختم ہو گیا۔ مگر جب کچ آیا تو رشی کی لڑکی دیویانی اُس پر شیدا ہو گئی تھی۔ اپنے باپ سے فرمائش کر کے اُس نے اُسے یہ وِدیا سکھانے پر رضامند کر لیا۔ جب کچ یہ وِدیا سیکھ چکا تو وہ واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دیویانی کہتی ہے ۔۔۔ "دیکھیو! اس وینومتی ندی کو مت بھول لیو۔ یہ تو خود محبت کی طرح بہتی ہے!"

کچ جواب دیتا ہے" اِسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔۔۔۔ اسی کے قریب اُس دن، جب میں یہاں پہنچا تھا، میں نے تجھے پھول چنتے دیکھا تھا اور میں نے کہا تھا۔ میرے لایق سیوا ہو تو کہو۔"

دیویانی کہتی ہے "۔۔۔ ہاں اِسی طرح ہمارا پیار شروع ہوا تھا۔۔۔ اب تم میرے ہو۔۔۔ عورت کے دل کی قیمت پہچانو۔۔۔ پیار کبھی کسی وِدیا سے سستا نہیں۔۔۔ اور اب تمام دیوتے اور اُن کا بھگوان اپنی مشترکہ طاقت سے بھی تمہیں واپس نہیں لے سکیں گے۔۔۔ اب مجھے پھول پیش کرنے کے خیال سے بیسیوں بار تم نے کتاب پرے پھینک دی تھی۔۔۔ ان گنت بار تم نے مجھے وہ گیت سنائے تھے جو سدا سُورگ میں گائے جاتے ہیں۔ تم نے یہ رویہ صرف اسی لئے تو اختیار نہیں کیا تھا کہ یوں مجھے خوش رکھ سکو اور آسانی سے وہ وِدیا سیکھ لو جسے

میرے پتا جی نے پہلے کسی کو سکھانا منظور نہیں کیا تھا۔۔۔۔"

کچھ کہتا ہے: مجھے معاف کر دے، دیویانی!۔۔۔ سُورگ میں تو مجھے ضرور جانا ہے۔۔۔ پھر میں تو برہمچاری ہوں!"

"برہمچاری!۔۔۔ ایک راہی کی طرح تو یہاں آنکلا تھا۔ دھوپ تیز تھی، چھاؤں دیکھ کر تُو یہاں آ بیٹھا۔ پھول چن کر تو نے میرے لئے ایک ہار بنایا تھا۔۔۔ اب خود ہی اپنے ہاتھوں سے تُو ہار کا دھاگا توڑ رہا ہے۔۔۔۔ دیکھ، پھول گرتے جا رہے ہیں۔۔۔!"

"برہمچاری تو میں ہوں ہی، سُورگ میں ہر کوئی میرے انتظار میں ہوگا۔۔۔۔ وہاں مجھے جانا ضرور ہے۔۔۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے اُس سُورگ میں مجھے اب شانتی نصیب نہ ہوگی۔

میں نے سوچا کہ ایک لحاظ سے میں کچھ سے کہیں زیادہ معقول وجہ پیش کر سکتا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں "سُورج کماری! تیری مُسکراہٹ صرف تیرے خاوند کے لئے ہونی چاہیے۔ دیویانی کی طرح تو کسی رشی کی کنواری لڑکی تھوڑا ہی ہے۔"

سُورج کماری انگڑائی لے رہی تھی۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ بائیں گال پر سرک آئی تھی۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولی "بس یا ابھی اور۔۔۔؟"

میں نے اُس کا پورا مطلب سمجھے بغیر ہی کہہ دیا "بس۔ اور نہیں۔"

"اَور نہیں؟ ..... خُوب رہی! مَیں تو ادھر کی زبان سمجھتی نہیں۔ تمہاری خاطر بابُوجی نے عزیزا کو یہاں بُلایا۔ اب تھوڑے سے گیت سُن کر ہی تمہاری بھُوک مِٹ گئی؟ تو یوں ہی گیتوں کی رَٹ لگا رکھی تھی پہلگام میں؟ ..."

مَیں نے کہا "نہیں بی بی جی، مَیں نے سوچا آپ کو نیند آ رہی ہے، اور شاید عزیزا بھی سونا چاہتا ہے۔"

عزیزا کچھ نہ بولا اور جے چند نے محفل برخاست کر دی۔ عزیزا اور رفیع چلے گئے۔ اور رسوئیا جے چند اور سُورج کماری کے بستر لگا کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔

سُورج کماری پُوچھ رہی تھی "بابوجی! سُنا ہے گپھا میں کبوتروں کا جوڑا ابھی درشن دیتا ہے؟"

"صبح کو تم خود ہی دیکھ لوگی۔"

"یہ کبوتر کہاں سے آتے ہیں؟"

"اب یہ مَیں کیا جانوں؟"

"ایک سُنارن نے بتایا تھا کہ یہ کبوتر شِو اور پاربتی کے رُوپ ہیں۔"

"شاید عورتوں کا وید یہی کہتا ہو۔"

رسوئیا سو چکا تھا۔ جے چند اور سُورج کماری بھی سو گئے۔ جیالال بولا۔ "اُف! کتنی سردی ہے!"

"کتنی سردی ہے! برہمچاری ہو کر بھی یہ سردی نہیں سہہ سکتے۔ شرم کا مقام ہے۔"

"برہمچاری تو میں ہوں۔ مگر اس آب و ہوا کا عادی نہیں ہوں۔"

"برہمچاری کو تو کسی بھی موسم سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔"

"تم بھی تو برہمچاری ہو۔" اُس نے طعنہ مارا۔

"تو میں کب ڈرتا ہوں؟"

"تو کیا تم خیمے کے باہر کھلے آسمان کے نیچے سو سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

یہ بات میں نے ہوش میں آ کر کہہ دی تھی۔ میں نے اپنی موٹی کشمیری لوئی اُٹھائی اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ جیالال میرے پیچھے بھاگا۔ میں رُک کر کھڑا ہو گیا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ سنّاٹا تھا۔

وہ بولا۔ "میں نے تو ہنسی میں کہہ دیا تھا اور تم سچ مان گئے۔"

"سچ ہو چاہے جھوٹ۔ میں دکھا دوں گا کہ برہمچاری ڈرتا نہیں۔"

"اچھا تو خیمے کے قریب ہی سو جاؤ۔"

میں خیمے کے قریب ہی لوئی میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ وہ اندر سے چٹائی نکال لایا۔ بولا۔ "اسے نیچے ڈال لو۔ ایسی تو کوئی شرط نہ تھی کہ ننگی دھرتی پر سو کر دکھاؤ گے۔"

چٹائی ڈال کر وہ میرے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ بولا "ارے یار! مفت میں کیوں جان گنواتے ہو؟"

"اُونہہ" میں نے شانے پھڑکاتے ہوئے کہا "مجھے کسی بات کا خطرہ نہیں۔"

"اچھا تو میں ٹھیکیدار صاحب کو جگاتا ہوں" جیالال بولا۔

پھر جیالال اُس مسلمان چرواہے کی کہانی سنانے لگا جس نے ایک بڑا کام کیا تھا۔ یاتری امرناتھ کا راستہ بھول گئے تھے۔ اُس نے اِسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ اور اِس کے عوض میں اب تک اُس کی اولاد کو چڑھاوے کا ایک معقول حصہ ملتا آ رہا ہے۔

مَیں نے شرارتاً کہا "وہ چرواہا ضرور اُس وقت برہمچاری ہو گا۔"

وہ ہنس پڑا اور اندر جا کر لیٹ رہا۔ مَیں چاند اور تاروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پُرانے زمانے میں بڑے بڑے رِشی اِدھر آتے تھے تو خیموں میں تھوڑا ہی رہتے تھے۔ یُوں کھُلے آسمان تلے پڑ رہتے ہوں گے۔ اِس کڑاکے کی سردی سے وہ ڈرتے نہ تھے۔

کچھ دیر کے بعد تارے میری نگاہ میں کانپنے لگے۔ چاند دُھند میں لپٹ گیا۔ خواب آلود پلکوں نے آنکھوں کو سی دیا اور . . . .

مَیں نے دیکھا کہ جیالال گھوڑے پر سوار سُورج کماری کو گجر اپیش کر رہا ہے۔ اور وہ پشاور کی ہرے دوپٹے والی جوان عورت عجب انداز سے

مسکرا رہی ہے۔ مَیں نے جیالال کو متنبہ کرتے ہوئے کہا "جیالال! تمہارا نصب العین عورت سے کہیں بلند ہے۔ . . . عورت ایک الیوژن ہے --- مایا!"

جیالال ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا اور بولا "لیکن یہ مایا بھی کس قدر حسین ہے۔ مجھے اس سُراب کے پیچھے سرگرداں رہنے دو"۔

عزیزا بید مشک کی ٹہنی لئے آ رہا تھا۔ مَیں نے معاً اُس سے سوال کیا "یہ کس کے لئے لائے ہو، عزیزا؟"

"اُس بہار کی دُلھن کے لئے جو خیمے میں اِس وقت مستِ خواب ہے"۔ عزیزا نے نیم مدہوش آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس وقت مجھے کسی سُورج کماری کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ گا رہی ہو ---" بید مُشک کی خوشبو میرے من میں بس گئی ہے . . . دُور جنگلوں میں چنبیلی کے پھُول کھِل گئے۔ کیا میری آواز تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی، میرے محبوب؟"

اُور جیسے کوئی جے چند کہہ رہا ہو "تمہاری آواز مَیں نے سُن لی۔ اُٹھو ہم چراگاہوں کی طرف چڑھیں گے"۔

پھر وہ سُورج کماری تتلیوں کے پیچھے بھاگی۔ جے چند بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ سُورج کماری کو دیکھ کر مجھے اُس چینی کنواری کا خیال آیا جسے تتلیوں نے پھُول سمجھ لیا تھا اور ٹولیاں بنا کر اُس کے گرد جمع ہو گئی

تھیں۔۔۔۔ مگر یہ تتلیاں تو سُورج کماری سے بھاگ رہی تھیں اور اُن کا پیچھا کرتے اُس کا سانس چڑھ رہا تھا۔ جے چند کو دیکھ کر مجھے چینی تاریخ کے اُس بادشاہ کی یاد آئی جس نے پنجروں میں سینکڑوں تتلیاں پال رکھی تھیں جب اُس کے باغ میں خوبصورت لڑکیاں جمع ہوتیں تو وہ حکم دیتا کہ پنجروں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ یہ تتلیاں بلا کی سیانی تھیں۔ وہ سب سے خوبصورت لڑکی کے گرد جمع ہو جاتیں۔ اور اس طرح یہ لڑکی بادشاہ کی نگاہوں میں بھی بچ جاتی۔۔۔ کیا اِس جے چند نے بھی تتلیوں کی مدد سے اِس سُورج کماری کو چُنا تھا؟ پر یہ تتلیاں تو نہ سُورج کماری کی پروا کرتی تھیں نہ جے چند کی۔۔۔۔۔

دوڑتی دوڑتی وہ سُورج کماری ایک چرواہے کے پاس جا پہنچی۔ بولی "بنسری پھر بجا لینا۔ پہلے میرے لئے تتلی پکڑ دو۔۔۔ وہ سُندر تتلی جو ابھی ابھی سامنے پھُول پر جا بیٹھی ہے"۔ شاید تتلی کی بجائے وہ اُس نوجوان چرواہے ہی کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اور پھر جب اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو اُسے جے چند نظر نہ آیا۔

وہ بدستور گا رہی تھی۔۔۔ "کہیں تم ملو گے نہیں، میرے محبوب؟ آرول کے پھُولوں میں تمہاری تلاش کروں گی"۔

کہیں سے کوئی جیالال آ نکلا۔ بولا "تُو نرگس ہے۔۔۔ خمار سے بھرپُور۔

تُو شرم سے گردن جھکائے ہوئے ہے"۔ اور وہ سُورج کماری بولی "باورے بھونرے! میں تیرے انتظار میں تھی"۔

جے چند کو آتا دیکھ کر جیالال بھاگ گیا۔ ورنہ وُہ بُری طرح پٹتا۔ جے چند بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ سُورج کماری سر جھکائے کھڑی تھی۔ پاؤں کے انگوٹھے سے وہ زمین کُریدتی رہی۔

مَیں نے تہیّہ کر لیا کہ مزید یہ کھیل نہ دیکھوں گا۔ اپنی لوئی میں سمٹ کر لیٹ گیا۔ سُورج کماری کا خیال تک میرے دِل میں نہ اُٹھے، بس یہی میری کوشش تھی۔ مگر سُورج کماری تھی کہ سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ میرے پاس آ بیٹھی اور پُرمعنی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اُسے اپنے بالکل قریب پا کر مَیں بہت گھبرایا۔ اور مَیں نے چلّاتے ہوئے کہا "عورت! — عورت مایا ہے۔ اور پھر مَیں تو ایک برہمچاری ہوں"۔

اُس نے میرا سر اپنے زانُو پر رکھ لیا۔ مَیں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا۔

"نہ بابا! مجھے پاپ لگے گا"۔

"اور مجھے بھی؟"

"ہاں"۔

"پیار تو پاپ نہیں"۔

مَیں چُپ رہا۔ وہ بولی "اب یاد آیا۔ جیالال سے گھبرا کے مَیں نے

اُسے تھوڑی سی مسکراہٹ دے دی تھی۔ اس دن سے تم کچھ تنے تنے سے رہتے ہو ۔ ۔ تمہارے ہاتھ کس طرح شل ہو رہے ہیں! جانتے ہو؟"

"ہو جانے دو"

"پاؤں نیلے ہو رہے ہیں!"

"ہونے دو۔ تم جاؤ"

وہ مجھے سہلاتی رہی۔ اس کے بازو کتنے پُر راحت تھے! ان میں کتنی گرمجوشی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے بھینچنے لگی۔ میں سنبھل نہ سکا۔ جسم ہارتا جاتا تھا۔

کیا سچ مچ میں وہ دیا ہوں جس کا تیل کبھی ختم نہیں ہوتا، جس کی بتّی کبھی بجھتی نہیں؟ کیا عورت مایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سورج کماری بھی مایا ہے؟ اس کے بازوؤں کی گرمجوشی، اس کی لمبی لمبی پلکیں، اور اس کے ابھرے ہوئے گال۔ کیا یہ سب مایا ہے؟ اس پیار سے خدا ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے۔ یہ بات تھی تو یہ صورتیں نہ بنائی ہوتیں، یہ جذبات نہ دیئے ہوتے۔

اوپر تارے جھلملا رہے تھے۔ میرے ذہن میں پیار کے جذبات جاگ رہے تھے۔ میں نے کہا "اپنے پریشان بال درست کر لو۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ "سورج کماری! تم نے کتنی تکلیف کی۔" میں نے کہا، "اس سردی میں تم یہاں بیٹھی ہو۔ خیمے میں چلی جاؤ۔"

وُہ کچھ نہ بولی۔ مجھے یہ محسوس ہُوا کہ بنسری میں سُرجاگ اُٹھیں گے......
ضروری نہیں ہے کہ بنسری مُنہ لگانے ہی سے بجے ..... ہوا بھی تو سُر جگا سکتی
ہے .... اور اُس کا گیت مُجھے ہمیشہ کے لیئے جیت لے گا۔
مجھے ایک پُرانی کہانی یاد آگئی۔ دیکھا کہ سامنے ایک آشرم ہے میں آشرم کے دروازے
کی طرف چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک سُندر کنواری کھڑی مُنہ بسُور رہی ہے۔ اندر سے رِشی نکلتا ہے
پُوچھتا ہے "کیا دُکھ ہے تجھے دیوی؟" لڑکی کہتی ہے "مجھے بسیرا چاہیئے"۔ رشی گھبرا جاتا ہے
"بسیرا!... پردیوی! یہاں تو عورت کے لیئے کوئی جگہ نہیں"۔ لڑکی کہتی ہے "صرف آج
کی رات ــــ صُبح ہی مَیں اپنی راہ لُوں گی"۔ رشی کہتا ہے "اچھا سامنے اُس کمرے میں چلی
جا۔ اندر سے سانکل لگا لیجیو"۔۔۔ نصف رات گزر جانے پر رشی کی ہوس جاگتی ہے۔ وُہ
لڑکی کے کمرے کی طرف آتا ہے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ "رشی دیو! یہ پاپ ہوگا"۔ لڑکی اندر سے
کہتی ہے "تم تو گویا میرے باپ ہو"۔ وہ دروازہ نہیں کھولتی۔ رشی چھت پھاڑنے لگتا ہے
... پیشتر اس کے کہ وہ چھت پھاڑ کر اندر کُودتا ہے، وہ سُندر کنواری اپنی
عصمت بچانے کے لیئے باہر بھاگ جاتی ہے ... پھر جیسے کسی نے تصویر
اُلٹی لٹکا دی۔ مَیں نے دیکھا کہ رشی اپنے ہون کُنڈ کے قریب سو رہا ہے۔ اور
وہ سُندر کنواری اُس کے پاس آ بیٹھی ہے۔ اُس نے رشی کا سر اپنے زانو
پر رکھ لیا ہے۔ رشی گھبراتا ہے، پیچ و تاب کھاتا ہے مگر پھیلتے اور سمٹتے ہوئے
بازوؤں کی گرفت اُسے بھاگنے سے روکے رکھتی ہے ......

میرا جسم سردی سے اکڑ رہا تھا۔ اپنی ضد پر جھنجلانے کے لئے جس گرمی کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ دل سے باتیں کرتے کرتے میں پھر نیند کے دھارے میں بہہ گیا.......

میرا سینہ گرم ہو گیا تھا۔ گردن بھی اور شانے بھی۔ پیٹ بھی گرم ہو رہا تھا۔ پیٹ کی نچلی انتڑیاں ٹھنڈے پانی سے نکل کر آگ کی طرف لپکنے والے بچوں کی طرح جدّوجہد کر رہی تھیں۔ گردن کے پاس تو گرم اور خوشگوار خوشبو میں لبی ہوئی سانس لپٹ رہی تھی۔ زانو ابھی بے حس تھے، جیسے وہ میرے نہ تھے اور پاؤں میں کسی نے سیسہ بھر دیا تھا۔۔ ٹھنڈا اور بھاری!

میں نے بولنا بند کر دیا تھا۔ کون جانے یہ کیا چیز تھی جو میرے اندر بہچر یہ کے خیال کا تعاقب کر رہی تھی۔ اِس خیال کی آواز جسم کی ایک ایک گہرائی سے سُنی اَن سُنی سی اُٹھ رہی تھی۔ یہ کچھ ایسی حالت تھی جو سوتے سوتے چھاتی پر ہاتھ آپڑنے سے ہو جاتی ہے .... کوئی میرا دل کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے ایک انگڑائی لی۔ ہاتھ کی ٹھنڈی اُنگلیاں پیٹ پر آگئیں۔ اب یہ گرم تھا۔ زانوؤں میں بھی کچھ جنبش محسوس ہوئی اور یہ بھی محسوس ہونے لگا، کہ پاؤں بھی اب میرے جسم سے الگ نہیں۔

سُورج کماری بھی چُپ تھی۔ مگر جب اُس کے بازو مجھے بھینچنے کے لئے

پھیلتے اور سمٹتے تھے، وہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی مگر اُس کے ہونٹ، جو دیر تک اُڑتے رہنے والے پرندوں کی طرح پر سمیٹ کر آرام کر رہے تھے، ہل کر رہ جاتے۔ ادھ سوئی سی اُس کی آنکھیں تھیں۔ جیسے گھنے جنگل کے سایوں میں کرنیں جھلملا اُٹھتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں کسی قدر خاموش مُسکراہٹ تھرتھرانے لگی۔ اپنی آنکھیں میں نے اُس کی گردن کی طرف موڑیں۔ دیکھا کہ اُس کی رگیں مدہوش سی لیٹی ہوئی ہیں۔

زور سے شانے ہلا کر میں اُس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے لگا۔ کیا یوں دیکھنا گناہ ہے؟ کیا برہمچریہ ہی سب سے اونچی چیز ہے؟ کیا اس کے لئے سب لُطف چھوڑ دینا چاہیئے؟ —— یہ سب لُطف جو خوبصورتی اگرمجوشی اور ازخود رفتگی سے مِل کر بنا ہے؟

سُورج کماری، جو پہلے کون جانے کس غنودگی میں اونگھ اونگھ جاتی تھی، اب شاید کسی سپنے کی راحت بخش چھاؤں کی بجائے خود زندگی میں تھرکنے والے پیار کا آنند لینا چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پھیلنے لگیں، پلکوں کی سیاہی دھیرے دھیرے دُور ہوتی گئی۔ میری آنکھیں کھُل گئیں۔ کچھ دیر تو نیلے آسمان کے گرد کرنوں کا نظارہ رہا —— ایک مست پھیلا ہوا نظارہ، پھر یہ نظارہ سمٹ کر سُورج کماری کی آنکھوں میں بدل گیا۔

میرا سر اُس کی گود میں تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ڈر گیا

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سورج کماری نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر پھیرا۔ دوبارہ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ خیمے کے اندر ہوں، پاؤں کے پاس انگیٹھی سُلگ رہی ہے، اور کئی اُداس چہرے میرے گرد جمع ہیں۔

دیکھنے کی قوت کے ساتھ ساتھ سُننے کی قوت بھی لَوٹ آئی۔ سنسکرت کے کچھ بول میرے کانوں میں پڑے۔ کوئی پنڈت جی میرے لئے پرارتھنا کر رہے تھے، اپنے آپ یا ان لوگوں کے کہنے پر۔

میں خاموش تھا۔ احسان مندی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اپنی ہٹ دھرمی پر پشیمان بھی تھا۔ یہ دونوں خیال کافی دیر تک رہے۔ پھر کچھ شیطانی جذبے، جن سے ہماری زندگی قائم ہے، دھیرے دھیرے جاگنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ ہٹ دھرمی نہ ہوتی تو سورج کماری کی گود کا لُطف اور سکون کیسے نصیب ہوتا۔ سورج کماری کی آنکھیں ایکا ایکی چمک اُٹھیں۔ میں ڈرا۔ کیا اُس نے میرے جذبات کا بھید پا لیا ہے؟ شرم، بے لبی، خود فریبی اور نہ جانے کن کن چیزوں سے پیدا ہونے والی ایک مسکراہٹ میری مونچھوں ہی میں کہیں گم ہو گئی۔

سورج کماری نے لوگوں سے کہا: "اب یہ ٹھیک ہیں۔۔۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ لوگ بستر وغیرہ سنبھالئے۔ امرناتھ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

لوگ اطمینان سے سفر کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ مگر پنڈت جی بدستور منتر پڑھے جا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ سُورج کماری نے ایک بار پنڈت جی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مُنہ موڑ کر ایک للچائی سی ادا سے مسکرا کر کہا۔ ”اٹھو، برہمچاری جی!۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

۴

تین گیت

اُس دن میرا ذہن اُس آسمان کی طرح تھا جس پر بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ بس ہوا چلنے کی دیر ہو اور سب بادل غائب ہو جائیں۔

ترویدی ٹھیک وقت پر آ پہنچا۔ مَیں نے اُسے بتایا "مَیں تمہارے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ تم آ نکلے اور اس لحاظ سے تمہاری عمر بہت لمبی ہے"۔

ترویدی ہنس کر بولا "مَیں اِن باتوں کا قائل نہیں"۔

وہ کاٹھیاواڑ میں بہت گھوما پھرا تھا۔ وہاں کے بہت سے گیت

اُسے زبانی یاد تھے۔ مجھے اُس سے بہت مدد مل رہی تھی۔ اُسے ایک بھی گیت یاد نہ ہوتا اور گیتوں کا وہ شوقین بھی نہ ہوتا تو بھی ہماری دوستی میں کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔ وہ اکثر کہا کرتا "میرے پاؤں میں چکّر ہے۔" اسے وہ وہم تصوّر نہیں کرتا تھا۔ اکثر وہ بتایا کرتا کہ کس طرح اسی کے زیر اثر وہ پرندے کی طرح اُڑتا رہا ہے۔ اُڑنے میں ہم ایک ہی سے تھے۔ شروع میں یہی بات ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔

گاڑی میں ہمیں کھُلی جگہ مل گئی۔ ہم سابرمتی جا رہے تھے۔ وہ بولا۔ "آج میں تیسری بار سابرمتی چلا ہوں۔"

پاس کی سیٹ سے ایک نوجوان بول اُٹھا۔ "سابرمتی؟ تب تو میں بھی آپ کا ساتھی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا "مجھے گاؤں کے گیت بہت بھاتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی ساتھ دو گے؟"

"خوشی سے۔"

پتہ چلا کہ وہ کاٹھیاواڑ کا رہنے والا ہے۔ سمندر کے کنارے ایک گاؤں میں جہاں وہ پیدا ہوا، اُس کا بچپن گزرا تھا۔ اُسے وہ دن اب بھی یاد تھے جب کوئی بلند آواز سے گا اُٹھتا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی بادل گرج اُٹھا ہے......

ترویدی نے کہا "اچھا تو ایک آدھ گیت ہو جائے، ذرا شغل رہے گا۔"

"مَیں گاؤں گا ضرور مگر آپ کو بھی کچھ سُننا ہوگا۔"

"ضرور"

"جو گیت مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وُہ ایک عورت کا گیت ہے۔"

"عورت کا؟ . . . کسی سُکھی عورت کا یا کسی دُکھیا کا؟"

"اب یہ آپ دیکھ لیں گے۔ بے چاری ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح تھی، اُس نے اپنی جوت دکھائی اور پھر . . . . "

ترویدی نے بات کاٹ کر کہا "بس اب شروع کیجئے۔"

"اتنی کیا جلدی ہے۔ مجھے جو کہنا ہے وہ ضروری ہے، بہت ضروری . . . ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ وہ عورت ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح سنسار سے اوجھل ہو گئی۔ کہانی یوں ہے۔ بارہ سال بعد ایک سپاہی گھر لوٹا تو اُس کا دل اپنی بیوی سے ملنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ وہ گھر میں نہ تھی۔ اُس کمرے میں، جہاں وہ فوج میں جانے سے پیشتر ہمیشہ سویا کرتا تھا، دیا جل رہا تھا . . . . . "

ترویدی بولا "اب اور تشریح ٹھیک نہیں۔ گانا شروع کیجئے۔"

وہ نوجوان گانے لگا :

" ماڑی بار بار برسے آدیو

ماڑی نی دیٹھی پاتلی پرمار رے، جاڑیچی ماں!
مولوں ماں دیو شنگ ولے رے!"

۔۔۔ ماں! بارہ سال کے بعد میں آیا ہوں۔ ماں! کہیں نظر نہیں پڑی وہ پرمار راجپوتوں کی بیٹی! او ماں ۔۔۔ "جاڑیچا" راجپوتوں کی بیٹی! محل میں دیے کی بتی جل رہی ہے!'

"دی کرا بیٹھو ویسی نے ہتھیار چھوڑ رے، کلیا کنور!
پانی بھری ہمناں آوشے رے؛"

۔۔۔ بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اُتارو۔ او میرے پرتاپی کنور! پانی بھر کر ابھی آجائے گی وہ؛

" ماڑی کوا نے دلوئوں جوئی لیو رے
ماڑی نو دیٹھی پاتلی پرمار رے، جاڑیچی ماں!
مولوں ماں دیو شنگ ولے رے!"

۔۔۔ ماں! کوئیں اور باؤلیاں دیکھ آیا ہوں۔ کہیں نظر نہیں پڑی وہ پرمار راجپوتوں کی بیٹی! او میری ماں ۔۔۔ "جاڑیچا" راجپوتوں کی بیٹی! محل میں دیے کی بتی جل رہی ہے!'

" دی کرا بیٹھی ویسی نے ہتھیار چھوڑ رے، کلیا کنور!
دلنا دلی ہمنا آوشے رے!"

ـــ ' بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اُتارو۔ او میرے پرتاپی کنور! (آٹا) پیس کر ابھی آجائے گی وہ!'

" ماڑی! گھنٹیو نے رنھڑا جوئی ولیو رے!

ماڑی! نو وہیٹھی پاتلی پر مار رے جاڑیجی ماں!

موٗوں ماں دیوشگ ولے رے!"

ــ ' ماں! چکیاں اور خراس سب دیکھ آیا۔ ماں! کہیں نظر نہیں پڑی وہ پرمار راجپوتوں کی بیٹی۔ او میری ماں ــ "جاڑیجا" راجپوتوں کی بیٹی! محل میں دیے کی بتّی جل رہی ہے!'

" دی کرا! ہیٹھی دیسی نے ہتھیار چھوڑرے، کلیا کنور!

دہاں کھاں ڑی نے ہماں آو شے رے!"

ــ ' بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اُتارو۔ او پرتاپی کنور! دھان کوٹ کر ابھی آجائے گی وہ!'

" ماڑی! کھارنیاں کھارنیاں جوئی ولیو رے!

ماڑی! نو دیٹھی پاتلی پرمار رے جاڑیجی ماں!

موٗوں ماں دیوشگ ولے رے!"

ـــــ ' بیٹا! نیچے بیٹھو۔ ہتھیار اُتارو۔ او میرے پرتاپی کنور! کپڑے دھو کر ابھی آجائے گی وہ!'

"ماڑی! ندیو نے نئے اال جوئی دلیو رے!
ماڑی! تو دیٹھی پاتلی پر مار رے جاڑیجی ماں!
موڑوں میں دیو شنگ دلے رے!"

— ماں! ندیاں اور نہریں دیکھ آیا ہوں۔ ماں! کہیں نظر نہیں پڑی وہ پرمار راجپوتوں کی بیٹی۔ او ماں — "جاڑیجا" راجپوتوں کی بیٹی! محل میں دیے کی بتی جل رہی ہے!'

" اپناں بجکا ماں کوری باندھنی رے!
اپنی باندھنی دیکھی نے بادر دہا ڈرے گوجارن ماں!
مولوں ماں آمبو موڑیو رے!"

— اس گٹھڑی میں کوری ساڑھی پڑی ہے۔ اُس کی اِس باندھنی[1] کو دیکھ کر جی چاہتا ہے سادھو بن جاؤں۔ او ہنیاری ماں! محل میں آم کا پیڑ سکھا ڈالا گیا ہے۔

" اپناں بجکا ماں کوری ٹیلڑی رے!
اپنی ٹیلڑی نانی نے ترشول تانوں لیے گوجارن ماں!
موڑوں ماں آمبو موڑیو رے!"

[1] "باندھنی" لفظ کا ترجمہ ساڑھی کے علاوہ چُنری بھی ہو سکتا ہے۔ "باندھنی" کا لفظی مفہوم ہے۔ "باندھ باندھ کر رنگی ہوئی۔"

— اِس گھٹری میں کوری ٹیلڑی[1] پڑی ہے، اِس ٹیلڑی کو کھینچ کر رجی میں آتا ہے کہ خودکشی کرنے کے لئے ترشول کھینچ لوں۔ او ہتیاری ماں! تو نے محل میں آم کا پیڑ سُکھا ڈالا ہے!

ترویدی بولا "اِس گیت کے متعلق میں نے سُن رکھا تھا۔ آج آپ کی زبان سے اسے سُن کر اور وہ بھی ٹھیٹ دیہاتی سروں میں، میرے دل میں ایک بار پھر کاٹھیاواڑ کی سیر کرنے کا خیال پختہ ہو گیا ہے۔ میرے پاؤں میں تو چکر ہے۔ میں ضرور وہاں جاؤں گا اور خود کسان عورتوں کی زبان سے یہ گیت سُنتے ہوئے آپ کی یاد تو آئے گی ہی...... ہاں تو سیا ہی سیانا نکلا۔ وہ سمجھ گیا کہ اُس کی بیوی مار ڈالی گئی ہے اور خود اُس کی ماں نے ہی یہ پاپ کیا ہے..... ٹوٹے ہوئے تارے کی تشبیہ دے کر آپ نے گیت کا سارا درد ہمارے روبرو رکھ دیا ہے...... اور گیت میں دُلھن کو آم کے پیڑ سے تشبیہ دے کر عورتوں نے اپنی وطنی شاعری کی گہرائی کا ثبوت دیا ہے......"

"ہاں، تو اب اپنا وعدہ یاد کیجئے...... کچھ سنائیے۔"

ترویدی نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ وہ نوجوان بولا "آپ خود سُنائیں یا ان سے سُنوائیں۔ کوئی بھی صورت ہو، شغل ہو جائے ذرا۔"

مَیں نے کہا "خاطر جمع رکھئے۔ مَیں ضرور سُناؤں گا...... ہاں، تو محل میں

[1] ٹیلڑی۔ کی طرح جو ماتھے پر بندی لگانے کے کام آتی ہے۔

دِیا آج بھی جل رہا ہے۔ یہ دِیا کبھی بجھنے کا نہیں۔ آج بھی وہ سپاہی جس کی سُندر بیوی کو اُس کی اپنی ماں نے مَوت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، اِس دِیے کی مدھم جوت میں بیوی کی کوری ساڑھی اور ٹیلڑی' دیکھ رہا ہے۔ اُس کی ہتیاری ماں، باپ کی سزا سے ڈری ہوئی، نزدیک آرہی اپنی موت کو کنکھیوں سے دیکھ رہی ہے! پت جھڑ کی جھُلسی ہوئی پتّی کی سی وہ عورت معافی کس مُنہ سے مانگے ؛

وہ نوجوان بولا" آج کا شاعر نہ جانے اِس کہانی کو کس طرح بیان کرتا مگر مَیں تو سمجھتا ہوں کہ کوری ساڑھی اور ٹیلڑی میں سپاہی کی مرحوم بیوی کے سارے جذبات پوشیدہ ہیں۔ وجُگ کا لمبا عرصہ اُس نے بنا سنگار کے گزار دیا۔"

ترویدی بول اُٹھا" اب یہ تقریر بازی چھوڑیئے۔"

"ہاں تو اب گیت شروع کیجئے۔"

"کیسا گیت ؟"

" ایسا ہی کوئی غمناک گیت سنائیے۔"

"اچھا تو سُنئے۔ ایسی ہی ایک کہانی راجپوتانہ کے گیت میں موجُود ہے :

"مائے! کالی رے کالایَن اُمڑی

مائے اَگڈل سا برسے میہہ

پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں!"

— ماں! کالی گھٹا اُمڈ آئی ہے، ماں! مُوسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔

ہریالے کھیت میں پپیہا بول اُٹھا:

"مائے بھر رے ناڑا بھر ناڑیا
مائے بھرپور رے بھیم تلاو
پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں"۔

— ماں! چھوٹے بڑے تالاب بھر گئے۔ ماں! بھیم تالاب بھی بھر گیا۔ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اُٹھا:

"مائے! مھے ہی نے سدھاواں چاکری
مائے! گھر ری تو ئے بھل وان
پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں"

— ماں! میں تو نوکری پر چلا ہوں۔ ماں! گھر تمہارے سپرد رہے گا۔ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اُٹھا:

"بیٹا! کتا رے ورساں ری چاکری؟
بیٹا! کتا رے ورساں رو کول؟
پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں"

— بیٹا! کتنے سال کے لئے (جاؤ گے) نوکری پر؟ بیٹا! کتنے سال کا قول کرو گے؟ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اُٹھا:

"مائے! بارا رے ورساں ری چاکری

ماٹے ! تیرا رہے ورہاں رد کول
پپیئو بولیو کھابڑ رہے کھیت میں"

— ماں ! بارہ سال نوکری (رہے گی)۔ ماں ! تیرہ سال (بعد آنے کا قول) (کرتا ہوں)۔ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اٹھا۔

..   ..   ..

" مائے ! کھٹ رہے کما ئے گھر آویا
مائے ! کتھی اے سیناں ری دھیب
پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں "

— ماں ! پیسہ کما کر میں گھر واپس آیا ہوں۔ ماں کہاں ہے وہ ساس سسر کی بیٹی ؛ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اٹھا۔

" بیٹا ! ایندھن پانی بہو گئی۔
بیٹا ! چھوٹو ڑو دیور یو ساتھ
پپئیو بولیو ہریالے کھیت میں"

— بیٹا ! بہو ایندھن اور پانی لانے گئی ہے۔ بیٹا ! چھوٹا دیور اُس کے ساتھ ہے۔ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اُٹھا۔

" مائے ! جل تھل سب میں ڈھونڈیا
مائے ! نہیں رے سنیاں ری دھیب

پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں"

—ماں! جل تھل تو میں سب ڈھونڈ آیا۔ ماں! کہیں نہ ملی ساس سُسر کی بیٹی۔ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اٹھا:

"بیٹا! گھٹی رے پیسن بہو گئی

بیٹا! چھوٹوڑی نندل ساتھ

پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں"

—بیٹا! چکی پر آٹا پیسنے گئی ہے بہو۔ بیٹا! چھوٹی نند اس کے ساتھ ہے۔ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اٹھا:

"ماۓ! گھر گھر گھٹی نیں جو ئی

ماۓ! نہیں رے سیناں ری دھیب

پپیئو بولیو ہریالے کھیت میں"

—ماں! گھر گھر چکی دیکھ آیا۔ ماں! کہیں نہ ملی ساس سسر کی بیٹی۔ ہریالے کھیت میں پپیہا بول اٹھا:

ترویدی نے کہا "اِن دونوں گیتوں میں تو گجرات اور راجپوتانہ بغلگیر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں"۔

"بے شک"

"راجپوتانہ کا گیت اُتنا آگے نہیں بڑھا جتنا کہ گجرات کا گیت"

"ٹھیک ہے۔ مگر اس میں سپاہی کے نوکری پر جانے سے پہلے کا منظر بھی تو آگیا ہے نا۔"

وہ نوجوان کہنے لگا "اب اتنی سی بات پر بحث فضول ہے۔۔۔ دونوں گیت ایک ہی کہانی کو چھو رہے ہیں، یہ تو ظاہر ہے۔"

میں نے کہا "سنیے ایک گیت اور سناتا ہوں۔ یہ ضلع انبالہ کا ہے":

'اور دِنوں تو سُوکھی سی ٹکیا
آج کیوں دی ساس کھیر کی تھالی ری؟'
'پہلے تو بہو تیری کٹی اکیلے
آج گھر آئے[1] تیرا بالم[2] ری'
'اور دِنوں تو کھٹی سی لسی
آج کیوں دیا دودھ کٹورا ری؟'
'پہلے تو بہو تھی میری ایانی[3]
آج ہوئی تو کسی جوگی[4] ری۔'
'اور دنوں تو ٹوٹی سی کھٹیا
آج دیا ساس، لال پلنگ ری۔'

۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

[1] آئے گا۔ [2] خاوند۔ [3] کمسن۔ [4] لائق۔

'اماں بھی دیکھی، بہنیں بھی دیکھیں
ایک نہ دیکھی میں نے سجنوں کی دھی[1] ری۔
''اونچی اٹاری، لال کواڑی[2]
وہاں چڑھ سوئی سجنوں[3] کی دھی ری۔

.. .. ..

'میں نے پکارا، باتھہ[4] بھی ہلائی—
پھر بھی نہ بولی سجنوں کی دھی ری!'

عورتوں کا یہ یقین ہے کہ سپاہی کی ماں سوتیلی تھی۔ وجوگ کے دنوں میں اُس کی بیوی نے بڑی بپتا کی زندگی گزاری۔ جس روز سپاہی کے واپس آنے کی خبر ملی، ساس نے اپنی بہو کے لئے کھیر پکائی اور اُس میں زہر ملا کر یہ کھیر اُسے کھلا دی۔ لال پلنگ پر اُس کی سیج لگائی گئی، جہاں وہ ہمیشہ کے لئے سو گئی۔ سپاہی نے گھر آکر اُس کی لاش دیکھی، تو کون جانے اُس کے دِل پر کیا بیتی ہوگی۔''

وہ نوجوان بولا۔'' مَیں تو اِس بات پر حیران ہوں کہ کس طرح ایک ہی کہانی ہندوستان کے تین الگ الگ زبانیں بولنے والے لوگوں کے گیتوں میں سما گئی ہے۔''

[1] بیٹی [2] دروازہ [3] ساس سُسر کی [4] بازُو

میں نے کہا "سارا ہندوستان ایک مُلک ہے۔ ایک ہی تمدّن ہے جو الگ الگ حصّوں میں اُوپر سے جُدا جُدا رنگ اختیار کر گیا ہے۔"

ترویدی بولا۔ "میری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ یہ گیت ہندوستان کے مختلف صُوبوں کی یگانگی پر نہیں بلکہ انسانی جذبات کی یگانگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ گو میں نے دُنیا کا سفر ابھی نہیں کیا مگر میرا دِل کہتا ہے کہ یہ غمناک کہانی دُوسرے مُلکوں کے گیتوں میں بھی مِل جائے گی۔ ... اگر میرے پاؤں کے چکّر نے سچ مُچ زور مارا تو میں پہلے لِتھوآنیا پہنچوں گا اور وہاں کوئی ایسا گیت ڈھونڈوں گا۔"

۵

ہرنی

"ارے او شکاری! چھاتیوں کے علاوہ میرے سارے جسم سے ماس لے کر مجھے چھوڑ دے۔ اتنا رحم کر۔ میرا بیٹا، جو ابھی گھاس نہیں کھاتا، میری راہ دیکھ رہا ہوگا!" ــــ یوں ایک سنسکرت شاعر نے، جس کا نام تاریخ کو یاد نہیں، کسی شکاری کے جال میں پھنسی ہوئی ایک ہرنی کی درد انگیز پکار اپنے ایک شلوک میں قلم بند کر دی تھی۔

مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ یہ گم نام شاعر، جس نے بہ ظاہر ممتا کے بنیادی پیار کا نمونہ پیش کیا تھا، اپنے وقت کے سماجی نظام سے غیر مطمئن ہو چکا

تھا۔ یہ ہرنی کون تھی؟ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ ہرنی کے رُوپ میں اُس نے اپنے وقت کی غریب مخلوق کو پیش کیا تھا۔ بھُوکے بیٹے کا واسطہ دے کر ہرنی نے شکاری کے دِل میں رحم کے جذبے کو اُبھارنا چاہا تھا۔ یقیناً شکاری نے اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا ہوگا جو بے درد سرمایہ دار اکثر صدیوں سے روا رکھتا آیا ہے۔

خاص کر اُس زمانے میں جب کہ ادب زندگی کی حقیقتوں سے پرے جا رہا تھا، جب کہ ادیب عوام کے بیچ میں نہیں بلکہ اُن سے الگ تھلگ کسی سردار یا راجہ کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتا تھا، جبکہ عوام کی بھُوک، بڑھتی ہوئی غریبی اور صدیوں کی غلامی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وہ اپنے سرپرست کی طبیعت بہلانے تک ہی اپنی تحریر کا حلقہ سمجھتا تھا، ہرنی کی یہ پکار سُنی اَن سُنی کر دی گئی ہوگی۔

شاعری کی زبان جذباتی فضا میں جنم لیتی ہے۔ لفظوں میں ایک قسم کا ناچ سا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کسی لفظ کا ذاتی مطلب دب جائے اور وہ شاعر کے وجدانی ماحول میں ایک نیا ہی مطلب پا لے۔ اِس گُم نام سنسکرت شاعر کا یہ شلوک[1] سادگی اور خلوص کا ترجمان ہے۔

[1] "آدائے مانسمکھِلم ستن درجھنگات
ماں مُنچ داگورِک یاہی کرُو پرسادم
اِدّیاپی گھاس کول گرسنان بھگیو
من مارگ وی کشن پرستیبو مدی آ!"

اُور اِس سادہ لباس میں اُس نے اپنے جذبہ کی حرکت، بے چینی اور کسک ہم تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دی ہے۔

ہمارے دیہاتی گیتوں میں ہرنی کی پکار نہ جانے کتنی صدیوں سے گونج رہی ہے۔ گاؤں کو ایسی بستی مت سمجھئے جہاں ایک سی عورتیں اور ایک سے مرد کسی نہ کسی طرح ملتی جلتی زندگی کے دن کاٹ کر چلتے بنتے ہیں مصیبت میں سارا گاؤں مل کر روتا ہے، مل کر کروٹ بدلتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھوک اور غریبی مٹ جائیں اور گم ہوئی آزادی پھر نصیب ہو جائے۔ ان پُر تحریک لمحوں میں ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ جس کے مطابق صرف قسمت پر شاکر رہنے کا مسئلہ پھیکا پڑنے لگتا ہے اور یہ خیال بھی کہ امیری اور غریبی کی حدیں سدا یوں ہی بنی رہیں گی، سمٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

پہلے ایک بنگالی گیت سُنئے:

"ہرینی گھاس کھائے
شکاری تماشا چائے
آچمبی تے ماری لو شیلیر گھا
تکھن ہرینی بلے رے —
کی شیل ماری لی بھائی تیرنداز رے!"

— ہرنی گھاس چر رہی ہے۔ شکاری نشانہ باندھ رہا ہے۔ اچانک

(اس نے) تیکھے تیر سے (ہرنی کو) گھائل کر دیا۔ تب ہرنی کہتی ہے ـــ کیسے تیکھے تیر سے گھایل کر دیا ہے تُو نے، او بھائی تیر انداز!'

"نہیر ہریتی آمی
کارو دھار ناہیں دھاری
رکت مانش آمار جگتیر ویری رے
کی شیل ماری لی بھائی تیرنداز رے!"

ـــ 'میں جنگل کی ہرنی ہوں۔ کسی سے کچھ ادھار نہیں لیتی۔ میرا لہو اور مانس دُنیا کا دشمن (ہو گیا) ہے رے۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تُو نے، او بھائی تیر انداز!'

"تور جلار جل نہ کھائی
تور بلیر گھاس نہ کھائی
بنا دوشے بدھیلی آمار پران رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!"

ـــ 'تیرے تالاب کا پانی پیا ہے نہ تیرے کھیت میں گھاس چرنے گئی ہوں۔ بغیر قصور ہی میری جان لے لی ہے رے! کیسے تیکھے تیر سے گھایل کر دیا ہے تُو نے، او بھائی تیر انداز!'

"نہ کھاؤ آئی لام چھاؤ آسے دودھ

نہ دیکھی لام تار چندر مُوکھ
نہ کہی لام سینہہ رسیر کتھارے
کی شِیل ماری لی بھائی تیرندازرے!"

—نہ (جی بھر کر) دودھ پلایا اپنے بچے کو۔ نہ (جی بھر) دیکھ پائی اُس کا چاند سا مکھڑا۔ نہ (جی بھر) اُس سے پیار کی باتیں کر پائی۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تُونے، او بھائی تیرانداز!

"مری تاتے دُوکھ نائیں
کنتُورے شِکاری بھائی
اُوپرے دیوتار کاچھے کی دِبے جواب رے؟
کی شِیل ماری لی بھائی تیرندازرے!"

—مَیں مر رہی ہوں، اس کا مجھے دُکھ نہیں۔ پر او شکاری بھائی! اُوپر دیوتاؤں کے رُوبرُو کیا جواب دے گا؟ کیسے تیکھے تیر سے گھایل کر دیا ہے تُونے، او بھائی تیرانداز!

"جکھن شُشُو موہ کھُدائے جلے
کاندی بے ماں ماں بلے
تار ڈاک دیوتار بُوکے نِشچیہ باجی بے رے
کی شِیل ماری لی بھائی تیرندازرے!"

— 'جب میرا بچہ بھوک سے تڑپ اُٹھے گا' ماں! ماں!!' کہہ کر روئے گا۔ اس کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں گونج اُٹھے گی۔ کیسے تیکھے تیر سے گھایل کر دیا ہے تُو نے' او بھائی تیرانداز!'

"تنگیر شنگی را بھائی!
کوئی اوہر ینار مٹائیں
دُودھیر شِشُو راکھی تے جتنے رے!
کی شیل ماری لی بھائی تیرنداز رے!"

— او میرے ساتھیو اور بھائیو! (میرے) ہرن سے کہنا کہ وُہ دُودھ پیتے بچے کو جتن سے پالے پوسے۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تُو نے' او بھائی تیرانداز!'

"جنمیر متو دیکھا شُنا
بلو تارے آر ہبے نہ
پھرائی لو سکل سادھ شکار ہر بانے رے
کی شیل ماری لی بھائی تیرنداز رے!"

— جنم بھر درشن اور بات چیت اب پھر نہ ہو گی' اُسے بتا دینا۔ (لو اب) خاتمہ ہُوا سب اُمنگوں کا رے! کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تُو نے او بھائی تیرانداز!'

"کون نا کا مار سے رے
اے شیل گڑی لو رے ؟
تار بنش ہوک نر بنش رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر نداز رے !"

— کس لوہار نے بنایا تھا یہ تیر ؟ اُس کا خاندان بغیر اولاد کے ہی مٹ جائے۔ کیسے تیکھے تیر سے تُو نے مجھے گھائل کر دیا ہے او بھائی تیر انداز![۱]

مجھے یہ گیت بہت پسند ہے۔ کسانوں کی زندہ اور روشن شاعری کا، جو ہندوستان کے ہر صُوبے میں صدیوں سے گُونج رہی ہے۔ یہ ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ ہرنی کے بول بہت تیکھے تُلے ہیں۔ شکاری، جو اُسے گھائل کر دیتا ہے، کچھ جواب نہیں دیتا۔ ہرنی اُسے طنزاً 'او بھائی تیر انداز' کہہ کر شرمندہ کرتی چلی گئی ہے۔ ہرنی کی زبان نہیں بولتی، دل بولتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ تیر بنانے والا لوہار کچھ کم ظلم نہیں کرتا۔ گیت کے آخری بند میں ہرنی اپنا سارا غصہ اُسی پر نکالتی ہے۔

ٹھیک بات تو یہ ہے کہ ہرنی کی پکار میں عوام کی آپ بیتی گونج اُٹھی ہے

[۱] ۱۹۰۵ء میں درگا داس لاہڑی نے "بانگالیر گان" (بنگالی کے گیت) نام کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک باب ہے "بر کشر کور گان" (انپڑھ شاعر کے گیت)۔ اُسی میں اِس گیت کو جگہ دی گئی تھی۔ یہ گیت ترپورا سے ملا تھا۔

مجھے یاد ہے ایک کسان نے کہا تھا "میری بیٹا گھائل ہرنی کی بیٹا ہے اور جب تک ہم کسانوں کا مانس ہرنی کے مانس کی طرح لذیذ رہے گا زمیندار بابو ہم پر تیر چلانے سے باز نہیں آئے گا۔"

دوسرا گیت "اُراؤں" لوگوں کا ہے جو چھوٹا ناگپور میں آباد ہیں:

۱ " ایکا ترتی ہرنی برچا؟
ٹاٹھا ٹولی نوں راہچا۔"
"پورب ترتی ہرنی برچا
ٹاٹھا ٹولی نوں راہچا۔"

۲ " ایکا ترتی سکاریں برچس؟
ہرنین تیرتی لوچس۔"
"پچھم ترتی سکاریں برچس
ہرنین تیرتی لوچس۔

۳ سکاریں گا لوچس
ہرنی ہی پونچھریں لوچس
ہرنی گا بونگا کیرا
ہائے ادین ائیوندا ڈکھ منجا۔"

--- "(۱) کس طرف سے ہرنی آئی؟ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔"

"پورب کی طرف سے ہرنی آئی۔ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے"۔(۲) "کس طرف سے شکاری آیا؟ اُس نے ہرنی کے تیر مارا"۔ "پچھم کی طرف سے شکاری آیا۔ اُس نے ہرنی کے تیر مارا"۔ (۳) "شکاری نے ہرنی کی دُم پر تیر مارا۔ ہرنی بھاگ گئی۔ ہائے! اُسے کتنا دُکھ ہُوا۔"

یہ گیت "کرما" ناچ کا ہے۔ ہر ایک بند کی دوسری اور چوتھی سطر دوبار گائی جاتی ہے۔ انتہا درجہ کی خوشی میں اُراؤں لڑکے اور لڑکیاں اپنے قومی ناچ میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ اُن کے سب کے سب کرما گیت خوشی کے ترجمان ہوں۔ کتنے ہی گیتوں میں، جیسا کہ اِس گیت میں بھی، وہ اپنی مصیبتوں کے سیدھے سادے مگر تاثیر میں ڈوبے ہوئے جذبات بیان کرتے ہیں جن پر اُن کے اپنے لہُو کے داغ دیکھے جا سکتے ہیں۔

تیسرا گیت راجپوتانے سے مِلا ہے:

" مرگے بنا مرگی ایکلڑی!
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مانیں مرگی نے ایکلڑی!
مرگے نے ڈھونڈن مرگی نیسری
ڈھونڈیو ڈھونڈیو بن کھنڈ چھان
مرگے بنا مرگی ایکلڑی
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مانیں مرگی نے ایکلڑی!

ــ ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو تنہا چھوڑ گیا۔ ہرنی ہرن کی تلاش میں نکلی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے سارا جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا"۔

"کتھیہ نہ لادھیو جلمی مرگلو

ڈھونڈ یا ڈھونڈیا ران کھمان

مرگے بناں مرگی ایکلڑی

مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی"۔

ــ کہیں نہ ملا وہ ظالم ہرن۔ بار بار اُس نے وہ جنگل بیاوان چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا"

"ڈھونڈت ڈھونڈت مرگی تھک گئی

ب کے آنکھیاں آنسو جھان،

مرگے بناں مرگی ایکلڑی

مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی"۔

ــ ڈھونڈتی ڈھونڈتی ہرنی تھک گئی۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا"۔

"کھانے ترداو مرگی ڈھے پڑی

کوئی یو دُکھ سہیو نہ جائے

مرگے بنا مرگی ایکلڑی

مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ مائیں مرگی نے ایکلڑی "

—" چکر کھا کر ہرنی گر پڑی۔ یہ دُکھ سہا نہیں جاتا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا"۔

کون جانے ہرن کہاں چلا گیا تھا؛ ضرور اُسے کسی شکاری نے مار ڈالا ہوگا۔ شروع سے اخیر تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہرنی دراصل کوئی گاؤں کی عورت ہے۔

چوتھا گیت پنجاب کا ہے:

"نہ ماریں ہیرے ہرن نوں ساڈی سُنی ہو جاؤ ڈار

مارو ے راجیا ہرنیاں بھاویں اِک دو بھاویں چار"

—" ہیرے ہرن کو نہ مارنا۔ ہماری قطار سُونی ہو جائے گی۔ راجہ! ہم ہرنیوں کو مار لے، ایک دو چاہے چار"۔

یہ گیت نامکمل ہے۔ یہ ہرنیاں راجپوتانہ کی "ہرنی" کی بہنیں ہی تو ہیں۔ یہ گیت مصیبت زدہ لوگوں کے آنسوؤں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں ایک اپنا ہی سوز ہے جو دِل سے نکلتا ہے اور ساری فضا میں سما جاتا ہے۔

پانچواں گیت بُندھیلکھنڈ (وسط ہند) کا ہے:

"موئے مار لے جاؤ ہمائے ہرنے جن مارو!
چریں پیا کے کھیت ہمائے ہرنے جن مارو!
کون دِسن کے ہو گئے سکاری، کون دِسن کے ہو گئے بہیلیا؟
کون دِسن کو جاؤ ہمائے ہرنے جن مارو!
اگم دِسا کے ہیں گئے سکاری، پچھم دسا کے ہیں گے بہیلیا،
پورب دِسا کو جائیں ہمائے ہرنے جن مارو!
کائے کی کھٹیاں کلئے کی تاتیں؛
کائے کی ڈوری لگاؤ ہمائے ہرنے جن مارو!
لوئے کی کھٹیاں تانت کی تانتیں
ریشم کی ڈوری لگائیں، ہمائے ہرنے جن مارو!"

ـــ مجھے مار لے جاؤ۔ ہمارے ہرن کو مت مارو۔ ہم تو اپنے پیا کے کھیت میں چرتے ہیں، ہمارے ہرن کو مت مارو۔ کس سمت کے شکاری ہو؟ کس سمت کے بہیلیا[۱] ہو؟ کس سمت کو جا رہے ہو؟ ہمارے ہرن کو مت مارو۔ آگے کی سمت کے شکاری ہو۔ پچھم کے بہیلیا ہو۔ پُورب کی طرف جا رہے ہو۔ ہمارے ہرن کو مت مارو۔ کس چیز کی کھونٹیاں ہیں؟ کس چیز کی تانتیں ہیں؟ ہمارے ہرن کو مت مارو۔ لوہے کی کھونٹیاں ہیں۔ تانت کی تانتیں ہیں۔

[۱] چڑیمار یا شکاری

ہمارے ہرن کو مت مارو۔
چھٹا گیت بھی بُندیلکھنڈ کا ہے:

"ارے پاہروی! مان لے میری بات
پاہروی! مان لے میری بات
جب ہیں پاہروی پھانسی روپی
چونسٹھ کھُنٹیاں گاڑیں
ہرنی کوُد بغل بھئی ٹھاڑی
ہرن کو بیدھو پاؤں
رام جی! ہرن کو بیدھو پاؤں!"

— اے شکاری! میری بات مان لے شکاری! میری بات مان لے!
جب شکاری نے پھندا لگایا (اُس نے) چونسٹھ کھونٹیاں گاڑیں۔ ہے
رام! چونسٹھ کھونٹیاں گاڑیں۔ ہرنی کوُد کر بغل میں جا کھڑی ہوئی۔ ہرن کا پاؤں
پھنس گیا ہے رام! ہرن کا پاؤں پھنس گیا۔

"ٹھاڑی ہرنیا جو سمجھا رئی—
سُنو پاہردی بات
موئے مار میرو پیا کے چھوڑ دے
ہوئیں نہ چونسٹھ رانڈ

پاہرڈی! ہوئیں نہ چونسٹھ رانڈ!"

— ہرنی کھڑی ہوئی یہ سمجھا رہی ہے — او شکاری! میری بات سُن۔ مجھے مار ڈال۔ میرے پیا کو چھوڑ دے تاکہ ہم چونسٹھ (ہرنیاں) رانڈ ہونے سے بچ جائیں۔ او شکاری! چونسٹھ (ہرنیاں) رانڈ ہونے سے بچ جائیں'

"ٹھاڑی ہرنیا آنسو ڈھارے —

سُن ہرنا موری بات

تم تو بیدھے جا پھندا ہیں

میرو کون حوال ؟

ہرنا! میرو کون حوال ؟"

— ہرنی کھڑی ہوئی آنسو گرا رہی ہے — او ہرن! میری بات سُن تُو تو اس پھندے میں پھنس گیا۔ میرا کیا حال ہوگا، او ہرن! میرا کیا حال ہوگا؟'

"ٹھاڑو ہرنا جو سمجھا ریو

سُنو ہرنیا بات —

با کے گھر کو خرچ بڑھاو

بیچ کھان دے ماس

ہرنیا! بیچ کھان دے ماس!"

— ہرن کھڑا ہوا یہ سمجھا رہا ہے — ہرنی! میری بات سُن۔ اُس کے

گھر کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ اُسے میرا مانس بیچ کر گزارا کر لینے دے، ہرنی! اُسے میرا مانس بیچ کر گزارا کر لینے دے!

" اتنی سُن کے چلے پاہردی
پھانسی ڈاری کاٹ
ٹھاڑی ہرنیا آنسو ڈھارے ـــــ
جوڑی ملائی بھگوان
پاہردی! جوڑی ملائی بھگوان!"

ـــــ اتنی بات سُن کر شکاری آگے بڑھا۔ اُس نے پھندا کاٹ ڈالا۔ ہرنی آنسو گرا رہی ہے۔ (کہتی ہے) بھگوان نے (پھر سے) جوڑی ملا دی شکاری! پھر سے جوڑی ملا دی!'

یہ وہ گیت ہیں جن میں عہدِ ماضی کی تصویریں محفوظ ہیں۔ ماضی بھی ایک آئینہ ہے۔ جس میں ہم انسانی سیرت کی ارتقائی حالتوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا کہ ہم اب تک کہاں پہنچے ہیں ممکن نہیں۔

جنہوں نے بدھ مت کی "جاتک" کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے انہیں "ستون مگ جاتک"

۱ دیکھئے The Suvannamigga Jataka جو کیمبرج یونیورسٹی پریس کی شائع کردہ Jataka کتاب ۵ نمبر ۳۹۵ میں ملے گی۔ پروفیسر E. B. Cowell نے یہ کہانیاں بڑی محنت سے مرتب کی ہیں۔

کی یاد آگئی ہوگی۔ کہانی بتلاتی ہے کہ کسی پچھلے جنم میں مہاتما بدھ سنہرے ہرن کے رُوپ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک دن کسی شکاری نے جال لگایا باقی سب ہرنیاں اور ہرن بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر ٹولی کا سردار یعنی وہ سنہرا ہرن خود جال میں پھنس گیا۔ وہ چلایا تو اُس کی رفیقۂ حیات دوڑی ہوئی آئی۔ بولی "تمہارے بغیر اب میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی؟"

ہرن بولا "میں بہت زور لگا چکا کہ پھندے سے چھوٹ جاؤں مگر تانت میرے پاؤں میں دھنستی چلی جارہی ہے۔" ہرنی کہنے لگی "فکر مت کرو۔ میں تمہیں بچا لوں گی۔" پھر جب شکاری نزدیک آتا دکھائی دیا، وہ بولی "شکاری! مجھے تم خوشی سے مار ڈالو۔ پر میرے سنہرے ہرن کو چھوڑ دو ۔۔۔ یا دھرتی پر پتوں کا بستر بچھا دو، جس پر ہم گر پڑیں۔ پھر میان سے تلوار نکال کر پہلے میری گردن کاٹ لو پھر میرے خاوند کی!" شکاری چکر میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا۔ آدمی بھی یوں اپنے آقا کے لئے جان دینے سے کترا جاتا ہے ۔۔۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ ہرنی انسان کی زبان بول رہی ہے۔ شکاری نے ہرن کو آزاد کر دیا۔ ہرن نے خوش ہو کر اُسے ایک لعل دیا جو اُسے کسی چراگاہ میں پڑا ہوا ملا تھا اور جسے اُس نے اپنے کُھر میں پھنسا رکھا تھا۔ اُس نے شکاری کو یہ تلقین کی کہ وہ اس سے اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرے اور شکار کا پیشہ چھوڑ دے۔

ممکن ہے "جاتک" کہانی کی پیروی میں ہی بندھیل کھنڈ کے کسانوں نے اپنے اِن دونوں گیتوں کی تخلیق کی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود جاتک کہانی نے دیہاتی گیتوں کی پیروی کی ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ بندھیلکھنڈی گیتوں کی زبان بہت پرانی نہ ہوگی۔ مگر گیتوں کے جذبات اُن کی زبان سے کہیں زیادہ پرانے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وقت کے ساتھ پرانے گیتوں کی زبان بدلتی رہتی ہے۔ جاتک کہانیوں کے متعلق بعض عالم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ وہ شروع میں عام دیہاتی کہانیاں تھیں اور گیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو اِن کہانیوں میں پروئے ہوئے ہیں دیہاتی گیتوں سے لئے گئے تھے۔

ساتواں گیت کونڈھ لوگوں کا ہے جو کہ گنسور اُودے گری (مدراس پریزیڈنسی) میں آباد ہیں:

" ایڑا اینوں گوڑی وِبدی گن، او پلاما گٹاتی!
او پلاما گٹاتی، او پلاما گٹاتی!
آنو گوساتا نگی ڈیگا نائیں، او پلاما گٹاتی!
کاڑیگی سولاتی ای، او پلاما گٹاتی!
اِبڑا اینوں گوڑی وِبدی گن، او پلاما گٹاتی!"

ــــ " شکاری! تم مجھ پر تیر چلاؤ گے؟ شکاری! او شکاری! جنگل ہیں

دوڑتی ہوئی، شکاری، مَیں گھاس چروں گی، ارے او شکاری! شکاری کیا تم مجھ پر تیر چلاؤ گے ؟'

"آنوں نائیں میڈا آہا نائیں اِی نے اُونے ترے اِی ماں!
ایڑا اینوں گوُرڑی وی وی گنا او پلا مبا گتاتی !
آنُوں نارا انانی گوُری، او پلا مبا گتاتی ؟
اینُوں ناں گی نہجا دی گنا او پلا مبا گتاتی !"

—' اپنے بچے کو ساتھ لئے اِدھر اُدھر گھوموں گی۔ شکاری! تو مجھ پر تیر چلائے گا؛ مجھ ہرنی پر تیر چلائے گا، ارے او شکاری؛ مجھے تیر سے مار ڈالے گا، او شکاری؛ مَیں دھرتی پر سو جاؤں گی، او شکاری: مجھے کھا جائے گا کیا، ارے او شکاری ؟'

جذبات و احساسات کی کہانی، جو لوگوں کے نسل در نسل چلے آنے والے گیتوں میں پائی جاتی ہے، سطحی امتیاز سے بہت کم متأثر ہوتی ہے۔ زبانیں الگ الگ ہیں۔ بات کہنے کا ڈھنگ بھی مختلف ہے۔ مگر الگ الگ علاقوں کی ذہنی یگانگی صاف ظاہر ہے۔ مصیبت کی ماری کوندھ عورت بھی خود کو اُس ہرنی سے تشبیہ دیتی ہے جو بڑا تصوّر ہی شکاری کے تیر سے گھائل ہو کر ہمیشہ کی نیند سو جاتی ہے، اور اِس کے بعد شکاری اُس کے جسم کا مانس خود کھائے یا کسی کو کھلائے، اِس سے ہرنی کی موت میں

کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہاں، موت سے پہلے ہرنی کے دل میں یوں سوالات کا اُٹھنا اس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔

آٹھواں گیت یو۔پی کے دیہات میں گایا جاتا ہے:

۱ چھا ایک پیڑ چھی اُلیا
توپت وَن گہہ بر
ارے راما تہی تر ٹھاڑھی ہرنیاں
سَت من اتی ان متی ہو!

۲ چرتئے چرت ہرنواں
تو ہرینی سے پُوں چھئی ہو
"ہرینی کی تور چرہا جھُران
کی پانی بن مُرجھی اُو ہو؟"

۳ "نہ ہیں مور چرہا جھُران
نہ پانی بن مُرجھی اُول ہو
ہرینا! آج راجا جی کے چھیٹھی
تو ہیں ماری ڈرہیں ہو!"

۴ مچئے بیٹھی کوشلیا رانی
ہرینی ارج کرئی ہو——

"رانی! مسُوا تو سمجھ ہیں رسوئیاں
کھلریا ہمیں دینی اُو!"

۵ پیڑوا سے ٹنگ ہئی کھلریا
ت من سمجھا اُب ہو
رانی! ہیری پھیری دیکھ ہئی کھلریا
جنگ ہرنیا جیتی ہو!"

۶ "جا ہُو ہرینی گھر اپنے
کھلریا ناہیں دیبئی ہو
ہرینی! کھلری ک کھنجڑی مڑھئو ہئی
ت راما مور کھیلی ہئیں ہو!"

۷ "جب جب باجئ کھنجڑیا
سبد سُنی ان کئی ہو
ہرینی ٹھاڑھی ڈھنکُولیا کے نیچے
ہرن ک بسُورئی ہو!"

(۱) "ڈھاک کا چھوٹا سا پیڑ ہے ایک۔ گھنے پتّوں سے لہلہاتا ہُوا۔ اُس کے نیچے ایک ہرنی کھڑی ہے۔ ہے رام! اُس کا من بہت اُداس ہے۔
(۲) چرتے چرتے ہرن نے پوچھا "ہرنی! چراگاہ سُوکھ گئی ہے کیا؟ یا پانی

کے بغیر مُرجھا گیا ہے (تیرا من)؟'

(۳) نہ میری چراگاہ سُوکھی ہے، نہ پانی کے بغیر مُرجھایا ہے (میرا من)۔ ہرن! آج راجہ کے (ننھے کی) چھٹی ہے۔ آج (راجہ کے شکاری) تجھے مار ڈالیں گے۔'

(۴) رانی کوشلیا مچیا[1] پر بیٹھی ہے۔ ہرنی عرض کر رہی ہے ـ 'رانی! (میرے ہرن کا) مانس تو (تمہاری) رسوئی میں پک رہا ہے۔ (ہرن کی) کھال مجھے دلوا دو۔'

(۵) 'یہ کھال میں پیڑ سے ٹانگ دوں گی۔ گھوم پھر کر (اُسے) دیکھا کروں گی۔ رانی! دیکھ دیکھ کر اپنے من کو سمجھاؤں گی جیسے ہرن جیتا ہو۔'

(۶) 'ہرنی! جا اپنے گھر کو چلی جا۔ یہ کھال میں نہ دوں گی۔ اس سے تو ڈفلی مڑھاؤں گی۔ (میرا) رام اس سے کھیلا کرے گا۔'

(۷) جب جب ڈفلی بجتی ہے (اُس کی) آواز سُن کر ہرنی کان کھڑے کر لیتی ہے۔ ڈھاک کے نیچے کھڑی ہو کر ہرنی ہرن کی یاد میں کھو جاتی ہے۔'

یہ چھوٹا سا گیت المیہ شاعری کے کسی بھی شاہکار سے ٹکر لے سکتا ہے۔ اسے "سوہر" گیتوں کی برادری میں جگہ ملی ہے۔ بیٹے کے جنم کی خوشی میں یہ کیوں گایا جاتا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت ممکن ہے کہ گلی محلے کی

[1] ایک قسم کی پیڑھی۔

عورتیں خوشی کی مستی میں اس گیت کے غمناک منظر کی طرف بہت توجہ نہ دیتی ہوں۔ مگر کوئی کوئی عورت تو ایسی بھی ہوتی ہوگی، جسے ہرنی کی درد انگیز کہانی میں اپنی زندگی کا سارا غم نظر آجاتا ہوگا۔

کوشلیا اور رام کے نام اس گیت میں کیوں پروئے گئے ہیں، اس کی تشریح آسان نہیں۔ تاریخی ناموں کو عام گھریلو زندگی کی دھرتی پر لا بٹھانے کا رجحان بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ دیہات میں گھر گھر ساس سسر میں کوشلیا اور دشرتھ کا تصوّر کیا گیا ہے۔ پھر ہر ماں اپنے بچے میں رام کی تصویر دیکھ لے، یہ کوئی ان ہونی بات نہیں۔ ہر صوبے میں گھریلو زندگی کے گیتوں میں رام، سیتا اور لکشمن تو کسانوں کی زندگی میں بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ مگر اس گیت میں بے رحم عورت کے روپ میں کوشلیا کا تصوّر ایک نامناسب رجحان کا ترجمان ہے۔

پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے لکھا ہے ــــ "ہرنی ہرن کی کھال اس لئے مانگتی تھی کہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر دل کو ڈھارس دے گی اور ہرن جیتا ہے، اس وہم کو سچ سمجھ کر ایک فرضی سکھ محسوس کرے گی۔ کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں جو اپنے مرحوم خاوند یا بیٹے کی چیزیں بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑتی ہیں اور تنہائی میں انہیں دیکھ دیکھ کر ایک خاص قسم کا سکھ محسوس کیا کرتی ہیں۔ آخر ہرن کی کھال کی کھنجری بنی۔ کھنجری جب بجتی تھی، تب اس کی آواز سے

ہرنی کے دِل میں محبت کی تاریخ جاگ اُٹھتی تھی . . . گیت کی ہرنی کی خاموش تڑپ اِنسان کے دِل کو ہلا دینے والی ہے۔ یہاں ہرنی کے بہانے سے کسی عورت نے اپنی ہی تصویر لاکر کھڑی کردی ہے[1]۔

نواں گیت بھی یو۔پی کا ہے :

یہ بھی "سوہر" گیت ہے۔ پھر ایک بار ہم ایک ہرنی کا من اُداس پاتے ہیں۔ سیتا گربھ وتی ہے۔ آج سیتا کے بیٹا ہوگا۔ اِس خوشی میں ہرنی کے پیارے رفیقِ حیات کو لکشمن ڈھونڈنے آئے گا۔ اور راجہ کا شکاری ہرن کو مار ڈالے گا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہرنی کوشلیا کے پاس جاکر ہرن کی جان بخشوا لیتی ہے۔ یہاں کوشلیا کی زبان سے جو لفظ کہلوائے گئے ہیں ہمدردی اور خلوص سے لبریز ہیں :

"چھوٹ موٹ پیڑوا ڈھیکُولیا

ت پتوا رے لہالہی ہو۔

راما تا ہا تر ٹھاڑھی ہرِینا

ہرن باٹ جوہئی ہوئے

— چھوٹا موٹا ڈھاک کا ایک پیڑ ہے۔ وہ پتوں سے لہلہا رہا ہے۔

[1] "کویتا کومدی — گرام گیت" (ہندی) پنڈت رام نریش ترپاٹھی ہندی کے مشہور ادیب ہیں۔ دیگر ادبی خدمات کے علاوہ دیہاتی گیتوں کے مطالعہ میں بھی آپ کی کوشش شاندار ہے۔

ہے رام! اُس کے پیچھے ہرنی کھڑی ہے۔ وہ ہرن کی راہ دیکھ رہی ہے!۔

"بن میں سے نکلے لا ہرینا

تت ہرینی سے پوچھلے ہو ـــ

'ہرنی! کا ہے تور بدن ملین

کا ہے مُنہ پی ار ہو؟"

ـــ جنگل سے ہرن نکلا۔ اُس نے ہرنی سے پوچھا ـــ ہرنی کس لئے تیرا

چہرہ اُداس اور پیلا پڑ گیا ہے؟'

"گئی لوں میں راجہ کے دواریا

تت بتیا سُن ائی لوں ہو

پیارے آجُو چھوٹے راجا ک بہیلیا

ہرن مروئی ہئیں ہو!"

ـــ راجہ کے دروازے پر گئی تھی۔ وہاں سے بات چیت سُن آئی ہوں۔

پیارے! آج چھوٹے راجہ اپنے شکاری سے ہرن کو مروا ڈالیں گے!'

"کیئی جے بگیا لگوٗلے؟

کیئی رے آئے ڈھُنڈلے ہو؟

ہرینی کے کر دھنیا گربھ سے

ہرن مروا دلے ہو؟"

— کس نے باغ لگوایا؟ کون (مجھے) ڈھونڈنے آیا؟ ہرنی! کس کی جوان بیوی گربھ وتی ہے کہ ہرن کو مروا ڈالیں گے؟'

"دشرتھ بگیا لگوئیں
لکھن آئے ڈھونڈلے ہو!
پیارے رگھوبر دھنیا گربھ سے
ہرن مرواوے ہو"

— دشرتھ نے باغ لگوایا۔ لکشمن (مجھے) ڈھونڈنے آیا۔ پیارے رام چندر کی جوان بیوی گربھ وتی ہے (اسی کے لئے) ہرن کو مروا ڈالیں گے'۔

"کر جوڑی ہرینی عرج کرے —
سُن کوشلیا رانی ہو!
رانی سیتا کے ہوئی ہیں نندلال
ہم ہی کچھ دی ہب تو"

— ہاتھ جوڑ کر ہرنی عرض کر رہی ہے — سنو، کوشلیا رانی! آج رانی سیتا کے ہاں بیٹا ہوگا۔ مجھے کچھ دو'

"سولوا مڑھئی بوں ڈھو سنگوا
بھوجنوا تل چاؤر ہو
ہرنی مجھکتہوا اجودھیا کے راج

ابھی بن بیچ رہتو ہو!"

"سونے سے مڑھاؤں گی رتیرے ہرن کے) دونوں سینگ! کھانے کو دُوں گی) تل اور چاول۔ ایودھیا کے راج رکا) سُکھ بھوگ، ہرنی! اور بے فکر ہو کر جنگل میں گھوم پھرنا"

ہرن بچ گیا۔ یہی بس ہے۔ ہرن کے سینگ سچ مُچ سونے سے مڑھائے گئے تھے یا نہیں، اِس کی ہمیں پروا نہیں۔ ایک گہرا احساس، جو کہ شلپ کے لفظوں میں موجود ہے، ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ زندگی میں رحم اور ہمدردی نے اپنی جگہ بالکل ہی گنوا نہیں دی۔ کمینگی اور خُود غرضی کا گھیرا تو ہے ہی۔ مگر زندگی کی کیچڑ سے بھی ایک کنول کھل اُٹھتا ہے، جس کی خوشبو سے آدمی کی زندگی میں ایک پاکیزہ احترام، ایک بلند پایہ جذبہ نصیب ہوتا ہے جس سے متاثر ہو کر ہم تمام جانداروں کے درمیان ایک خاص قسم کی یگانگی محسوس کرتے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا تقابلی مطالعہ بہت اہم ہے۔ اُن صوبوں میں بھی، جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی زبانوں میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، کتنے ہی فارسی اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ بار بار مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ زبان کے متعلق ہمارا تعصب سر سے سطحی اور بناوٹی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کسی لفظ

کا استعمال نہیں کرتے کہ اُس کا حسب نسب، جنم استھان یا مذہب کیا ہے؟
بلکہ ہر لفظ اُن کی زبان پر اسی طرح آتا ہے، جیسے دھرتی پر کوئی پودا اُگتا ہے
تلاش کرنے پر ہرنی کے گیت دُوسری زبانوں میں بھی مِل جائیں گے
... ہندوستان کے طول و عرض میں ہرنی کی پکار گونج رہی ہے۔ مگر سوال
تو یہ ہے کیا ہمارا وطن یوں ہی بےبس رہے گا؟ کیا ہماری قوم یوں ہی مُنہ
بسورتی رہے گی؟ "شکاری بھائی" کب تک اُس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ کب
ناچے گی ہرنی خوشی میں آکر

۶

دِیا جلے ساری رات

یُوں جُدائی کے گیت مَیں نے اکثر سُنے تھے۔ پنجابی ہی میں نہیں، ہندوستان کی دُوسری زبانوں میں بھی۔ بہتوں کو مَیں نے بے حد پسند کیا تھا۔ پھر میری شادی ہو گئی۔ اور وُہ بھی ایک ترکیب سے، تو نہ جانے کیوں میرا رُجحان بدل گیا۔ جُدائی کے گیت مجھے بہت زیادہ پسند نہ آتے تھے، اُن کی پہلی کشش کہیں کھوئی گئی ہو جیسے۔

ہاں، وہ ترکیب بھی بتا دوں جس سے میری شادی ہو گئی۔ جگہ جگہ کی مسافرت کے بعد —— اڑھائی تین سال گھر سے باہر خانہ بدوشی کی سی زندگی گزار کر —— مَیں گھر پہنچا تھا۔ مَیں تو اسے مسافرت ہی سمجھتا تھا، یہ دوسری بات

ہے کہ پتا جی اِسے نری آوارہ گردی کا نام دے رہے تھے۔ شادی کا سوال اِس لئے اُٹھا کہ میں گھر سے بندھ جاؤں۔ خانہ بدوشی سے مُنہ موڑ لوں، دل کی طنابیں اور محبّت کی ڈور اپنے گاؤں کے ساتھ باندھ لوں۔ پتا جی کے اِس چھُپے خیال کو میں نے شروع ہی میں بھانپ لیا تھا۔ میں نے شادی کے لئے ہاں کہہ دی، تو گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ میں جانتا تھا کہ شادی کے بعد میری ذمّہ داری بڑھ جائے گی۔ محبّت کہتی تھی، ابھی ذمّہ داری کی بات نہ چھیڑو۔ مالی سوال سے جیسے محبّت کا کوئی تعلّق ہی نہ تھا۔ لمبی مسافت میں میں کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کیا کرتا تھا۔ محبّت کے جذبہ نے مجھے جُوا کھیلنے کے لئے تیار کر دیا۔

جس لڑکی سے میری شادی ہونی قرار پائی، اُسے میری ماں دیکھ آئی تھی۔ میں جان لینا چاہتا تھا اُس لڑکی کے دِل کا حال۔ جب وُہ مُسکراتی ہے اُس کی آنکھوں میں کون سی کرن دوڑ جاتی ہے، یہ بھی میں جان لینا چاہتا تھا۔ اُسے کِس طرح کے خواب آیا کرتے ہیں؟ یہ سوال بار بار اُٹھا مگر بس دل کی گہرائیوں میں ہی بند رہا۔ ماں سے تو یہ سب باتیں پُوچھی نہ جا سکتی تھیں، اور یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ ماں اِن سوالات کا جواب دے بھی سکتی ہے یا نہیں۔

ایک فکر ایک دن بادل کی طرح اُٹھا اور دھیرے دھیرے دل کے

کونوں تک پھیلنے لگا۔ کیا وہ اجنبی لڑکی یہاں آتے ہی مجھ پر ایسا جادو ڈال سکے گی کہ میں باہر نہ جا سکوں گا، خانہ بدوشی کو خیر باد کہہ دوں گا؟ پیچھے ہٹنا بھی تو ممکن نہ تھا۔ آخر میں نے یہ سوچ کر کچھ تسلی پائی کہ شاید وہ تتلی کی طرح پنکھ پھیلا پھیلا کر میرے ساتھ ساتھ اُڑا کرے گی، میرے ساتھ وہ بھی خانہ بدوشی اختیار کرے گی۔

ہاں، تو جُدائی کے گیت کی بات تو میں بھول ہی رہا ہوں۔ شادی کے بعد ایک دن میں نے سسرال میں نوجوان لڑکیوں کو ایک گیت گاتے سُنا۔ گیت کی لے میں ایک خاص سوز بھرا تھا۔ ترنّم بھی موجود تھا۔ مٹی کے ٹمٹماتے دیئے کی طرح ہی جیسے خود جُدائی ٹمٹما رہی تھی، ٹیپ کے گیت پر پہنچتے ہی سب لڑکیاں عجب زور دار ڈھنگ سے آواز مِلا کر گاتی تھیں:

"دِیوا بلے ساری رات، میریا ظالما
دِیوا بلے ساری رات
بتیاں بٹا رکھدی، میریا ظالما
دِیوا بلے ساری رات"
آ دیئے گا تاں پُچھ لواں گی
میریا ظالما!

کتھے گزاری ساری رات ؟
بتیاں بٹا رکھدی
میریا ظالما!
دیوا بلے ساری رات !

"آوینگا تاں پُجھ لواں گی
میریا ظالما!
کتھے گزاری ساری رات !
دیوا بلے ساری رات
میریا ظالما !
دیوا بلے ساری رات !"

— دِیا ساری رات جلتا رہتا ہے' او میرے ظالم !
دِیا ساری رات جلتا رہتا ہے
بتیاں تیار کروا رکھتی ہوں' او میرے ظالم !
دِیا ساری رات جلتا رہتا ہے!
تُو آئے گا تو میں پُوچھ لُونگی۔
او میرے ظالم !

کہاں گزاری ساری رات؟
بتّیاں تیار کر وا رکھتی ہوں
او میرے ظالم!
دِیا ساری رات جلتا رہتا ہے!

تُو آئے گا تو مَیں سمجھ لُوں گی
او میرے ظالم!
کہ تُو نے کہاں رات گزاری۔
دِیا ساری رات جلتا رہتا ہے
او میرے ظالم!
دِیا ساری رات جلتا رہتا ہے!'

دُور سے مَیں نے یہ گیت سُنا تو سوچا کہ کیا اُدھر توجّہ نہ دوں۔ مگر مَیں نہ رہ سکا۔ مجھے نزدیک آتے دیکھ کر لڑکیوں نے گیت بند کر دیا۔ اُن میں میری نئی نویلی بیوی بھی تھی۔ گیت بند کرنے کی صلاح رانو نے دی تھی، یہ معلوم ہوتے دیر نہ لگی۔ سبھی سہیلیاں ایک دُوسری سے اُلجھنے لگیں۔ پرسنّی نے کہا، "کیوں ری رانو، اب گاتی کیوں نہیں ری؟ کیا تُو چاہتی ہے کہ جیجا جی تیری منّت کریں؟"

پاس سے سوشیلا بول اٹھی "ہاں، ہاں، تو کیا سمجھتی ہے پرسنی؟ ہمارے گیت کیا مفت میں آتے ہیں؟"

میرا جی چاہتا تھا گیت شروع ہو۔ سوچتا تھا، دُور سے ہی کیوں نہ سُنتا رہا۔ اب منّت نہ کرتا، تعریف کے دو لفظ کہہ دیتا تو بھی شاید لڑکیاں اپنا گیت پھر چھیڑ دیتیں۔ مگر میں اتنی جرأت بھی تو نہ کر سکا۔

جلد گیت محفل برخاست ہوگئی۔ کالی کالی آنکھیں مُڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اوجھل ہوگئیں۔ اب نہ رانو تھی، نہ پرسنی جن کی آنکھوں میں اُن کے دل دیکھے جا سکتے تھے۔ پرسنی سے بھی زیادہ مجھے رانو سے اُلفت تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ گیت گانے میں کوئل تھی، اس سے بھی زیادہ اس لئے کہ وہ بھولی تھی اور آنکھ میں دل رکھ کر مسکرانا جانتی تھی، بے نیازی کے انداز سے۔ ننھے بچے بیر کی طرح اُس میں ایک تازگی تھی، خاص اپنا پن لئے ہوئے۔

یہ گیت میں نے پہلے بھی سُنا تھا مگر کبھی مجھ پر اتنا اثر نہ ہُوا تھا۔ ایک بار میں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اب معلوم ہُوا کہ اُس وقت مجھ پر اس کی رُوح ظاہر نہ ہوئی تھی۔ گیت کیا ترجمہ کی چیز ہو سکتی ہے؟ اور پھر برہن کے دِیے والا یہ گیت!

رانو نے اسے کسی اچھوتی طرز میں گایا ہو، یہ بات نہیں۔ اُس سے

کہیں اچھا تو مَیں خود گا لیتا ہوں، اور اکثر گایا کرتا ہوں۔ پھر بھی نہ جانے اُس روز رالو اور اُس کی سہیلیوں کی زبان سے یہ گیت سُن کر مجھ پر اس کا اتنا اثر کیوں ہُوا؟

سُسرال سے واپس آکر جیسے میں اور سب گیت بھُول گیا۔ میری پسند کا ایک ہی مضمون تھا اور وہ تھا "برہن کا دِیا" اور اُس کا گیت "جُدائی کا یہ گیت" میری ساری زندگی پر چھا جانے کے لیئے تیار دکھائی دیتا تھا۔

اپنی بیوی کو یہ گیت سُنانے کے لیئے مَیں بہت کہتا، وہ شرما جاتی، اُس کی آنکھیں اُوپر نہ اُٹھتیں۔ نہ ہاں، نہ نہیں۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وُہ کس شرط پر یہ گیت سُنانے کے لیئے تیار ہو سکتی ہے۔ مجھے ہلکا سا غصّہ بھی آجاتا۔ بنگال، گجرات، اور مہاراشٹر میں مَیں ایک دم اجنبی لڑکے لڑکیوں سے گیت سُن آیا تھا۔ اور یہاں مَیں اپنے گھر میں گیت سُننے میں ناکام ہو رہا تھا۔

پھر ایک دن مجھے وہ گیت پاس آتا محسوس ہُوا۔ ایسے موقع پر میری آنکھیں للچا جاتی ہیں، چاہتا ہوں، اپنا دل چھاتی سے نکال کر آنکھوں میں رکھ لوں۔ "اب چھوڑو یہ شرم کی رسم!" مَیں نے اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ جھجک کر بولی "مَیں تو خود چاہتی ہوں کہ نہ شرماؤں"

مَیں سمجھ گیا کہ اب کامیابی دُور نہیں۔ بولا " تو پھر مل جائے سننے کو وہی برہن کے دِیے والا گیت "۔ مگر وہ کوئی دُوسرا ہی گیت سُنانے کے لئے تیار ہوئی تھی۔ تھا وہ بھی برہن کا گیت۔ مَیں نے کہا " اچھا وہی سناؤ "

گیت شروع کرتے کرتے وہ شرما چلی تھی۔ کافی گہرا گیت تھا۔ پانچ دریاؤں کے وطن کی ــــ پنجاب کی ــــ کسی سوہنی یا ہیر کا پُرسوز گیت تھا:

" اُدہ گئے سجن اُدہ گئے

لنگھ گئے دریا

اساں رَج گلاں نہ کیتیاں

ساڈے منوں نہ لتھڑا چا! "

ــــ ' وہ گیا۔ پریتم وہ گیا۔ وُہ دریا کے اُس پار چلا گیا۔ نہ ہم نے جی بھر کر باتیں کیں، نہ ہمارے دِل کا شوق پُورا ہُوا! '

یہ عورت کا گیت تھا اور عورت ہی ایسا اثر پیدا کر سکتی تھی۔ یہ وُہ بھی جانتی تھی کہ مَیں برہن کے دِیے والا گیت نہ چھوڑوں گا، نہ اُس کی جگہ کوئی دُوسرا گیت لے سکے گا۔

پھر کئی کئی دن تک مَیں نے گیتوں کی بات چھیڑنی ہی بند کر دی۔ گاؤں سے لاہور آ کر بھی مَیں نے یہی طریقہ جاری رکھا۔ اُمید کہتی تھی، کبھی نہ کبھی میری بیوی ضرور برہن کے دِیے والا گیت گانے لگے گی۔ مگر انتظار

کو یُوں ہی تھک جانا پڑا۔

پھر لاہور سے گاؤں واپس آکر بھی مجھے وہ گیت سننے کو نہ مِلا۔ اب مجھے بہت جلد باہر مسافرت پر جانا تھا۔ پتا جی نے لاہور میں چند ماہ گزارنے کی منظوری بھی بڑی مشکل سے دی تھی، اِس لئے میں نے کسی دن چوری سے لمبے سفر پر بھاگ جانے کی ٹھان لی تھی۔ پتا جی نے سوچا تھا کہ لاہور میں چند ماہ بیوی سمیت رہ کر اب میں گھر پر آرام سے رہنے کا فیصلہ کر لُوں گا۔ اور پھر دھیرے دھیرے وُہ مجھے اپنے ساتھ نہر پر ٹھیکیداری کا کام سپُرد کر دیں گے۔ اُن کو شاید معلوم نہ تھا کہ لاہور میں اِن چند ماہ کی رہائش کے دَوران میں پیش آنے والی مالی دِقّت کو مَیں نے خوشی خوشی جھیل لیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ کٹھن دن تو مَیں اپنی پہلی مسافرتوں میں دیکھ چکا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں ایک بار کالج سے واپس آکر جب مَیں نے کشمیر جانے کی ٹھان لی تھی، اور گھر سے اجازت نہیں مِلی تھی تو مَیں چوری ہی کشمیر کے لئے چل پڑا تھا۔ اِن دنوں بلا ٹکٹ سفر کرنے کا حوصلہ کتنا زوردار تھا! اور پھر تین ماہ تک جو سیر کی تھی، اُدھر کے گیت سُننے کے لئے جو فقیری دھارن کی تھی وہ لاہور میں اِن تازہ غریبی کے دنوں سے کہیں زیادہ سخت تھی۔

پہلی مسافرتوں میں مَیں اکیلا ہی تھا، جیسی زندگی خود چُنی تھی، اُس میں پیش آنے والے سُکھ دُکھ کو اپنی چیز سمجھ کر مست رہنا تھا۔ مگر اب تو میری

شادی ہو چکی تھی۔ اگر میں چاہتا بھی کہ اپنی بیوی کو سفر پر ساتھ لے جاؤں تو پتا جی کبھی اجازت نہ دیتے۔ اور اگر وہ ناراض ہو کر کہہ بھی دیتے کہ جا کر لے اپنی من مانی، تو بھی شاید میں اُسے باہر لے جانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ نئی نویلی بیوی سے بچھڑنا میرے لئے ایک کڑا سوال تھا۔ مگر پاؤں کا چکّر زور مار رہا تھا۔

"تمہارے بیٹے کے پاؤں میں چکّر ہے: وہ کہیں ایک جگہ ٹِک کر نہ بیٹھ سکے گا۔ پاؤں کا چکّر بڑا زبردست ہوتا ہے اور جس کے پاؤں میں قدرت نے چکّر ڈال دیا ہو اُسے بس بے پَر کا پرندہ سمجھو۔ وہ اُڑتا ہے اور دُور دُور کی ہوا کھاتا ہے۔" اِن الفاظ کے ساتھ بچپن ہی میں ایک جیوتشی نے میری ماں کو فکرمند بنا دیا تھا۔ گو وہ جیوتشی یہ پیشین گوئی نہ کر سکا تھا کہ مجھے دیہاتی گیتوں کے لئے پرندہ بننا پڑے گا مگر ماں دل ہی دل میں اُس جیوتشی کی جادو بیانی کا سِکّہ مان رہی تھی۔

میں نے سوچا اِس مسافرت کے دَوران میں کوئی ایسی ترکیب ضرور نکال لوں گا جس سے میں ہمیشہ بیوی سمیت سفر کرنے کا وسیلہ کر سکوں۔ شادی نے میرا نقطۂ نگاہ بدل دیا تھا "پیسہ چاہئیے پیسہ" یہ آواز تھی جو اکثر میرے دِل پر اپنا اثر کرتی رہتی۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے کی بات کبھی کی ختم ہو گئی تھی۔ اب تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا سوال تھا۔ نوکری نہ کرنے کی میں نے قسم کھا رکھی تھی۔ پھر پیسہ کہاں سے آئے؟ مضمون نویسی کی جائے

دل نے جھٹ کہہ دیا۔ اخباروں اور رسالوں میں دیہاتی گیتوں پر مضمون لکھ کر زیادہ روپیہ پیدا کرنا مشکل ہے۔ یہ میں جانتا تھا۔ اور اب تک مجھے کبھی یہ بھی تو نہ سوجھی تھی کہ میں گیت کیوں جمع کر رہا ہوں۔ بچپن ہی میں یہ شوق لگ گیا تھا۔ ہائی سکول کے ایام میں یہ دبنے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ کالج کی زندگی بھی اس شوق کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور یوں ہی میں نے دیکھا کہ کالج کی آب و ہوا میری فطرت کے خلاف ہے۔ میں بھاگ نکلا اور لگا گھومنے اور گیت جمع کرنے۔ اب جب گیتوں پر لکھنے کا خیال گیہوں کے پودے کی طرح دل کی دھرتی میں روز بروز ہرا ہونے لگا تو جیسے گیتوں کے متعلق میرا شوق اور بھی جوان ہو گیا۔ مضمون نویسی سے زیادہ پیسہ نہ آئے نہ سہی، جتنا آئے اُسی سے گزارہ کریں گے۔ آخر پیسہ ہی تو زندگی کا مقصد نہیں۔ وطن کے رسالوں میں لکھنا چاہئے اور ولائت کے رسالوں میں بھی۔ یہ تصفیہ دھیرے دھیرے جڑ پکڑتا گیا۔

اور ایک بات اور بھی تو تھی۔ چند ماہ اپنی بیوی کے ساتھ گزار کر میں نے ابھی وہ بات پیدا نہ کی تھی کہ وہ لمبی مسافرت پر میری فقیری میں شامل ہو سکتی۔ نہ میں پوری طرح اُس کا دل پڑھ سکا تھا اور نہ وہی میرے کام کی اہمیت سے واقف ہو سکی تھی۔ جدائی کا آنے والا زمانہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چوری سے ایک دن بھاگ نکلنے کی بات میں نے مارے ڈر کے اُسے نہیں بتائی تھی۔ ان دنوں خاص کر برہن کے دیئے والا گیت سننے کے

لئے مَیں ترس رہا تھا اور صرف للچا کر رہ جاتا تھا۔

جس دن صبح سے دو تین گھنٹے پہلے ہی مَیں نے جانے کی ٹھان رکھی تھی اُس سے پہلی رات چوبارہ میں بیٹھ کر میری بھولی بیوی نے مجھے ایک دُوسرا ہی گیت سُنا دیا۔ یہ گیت پنجاب کی عورت نے میدانِ جنگ میں جانے والے اپنے سپاہی خاوند کو مخاطب کر کے گایا تھا:

"جے اُٹھ چلئیوں چاکری
نیلے گھوڑے والیا!
سالوں بوجھے پا!
جتھے تے آوے راتڑی
نیلے گھوڑے والیا!
کڈھ کلیجڑے لا!"

—'اگر تو (جنگی) نوکری کے لئے چل پڑا ہے تو اے نیلے گھوڑے کے سوار مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چل۔ مجھے تو اپنی جیب میں ڈال کر لے چل، پریتم! جہاں کہیں راستہ میں رات پڑ جائے تو مجھے جیب سے نکال کر اپنے سینے سے لگا لیا کرنا!'

نہ میں کہیں جنگ پر چلا تھا، نہ میرے نیچے نیلا گھوڑا ہی تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہُوا کہ یہ گیت میرے لئے ہی بنا تھا۔ مگر دل تو

للچا رہا تھا برہن کے دِیلے والا گیت سُننے کو۔

ڈلہوزی کے پہاڑی گاؤں مجھے بہت پسند آئے۔ ماں کے چہرے پر جو رونق اور جو محبّت کی پُر از یقین رنگینی ہوتی ہے، وہ سب پہاڑ کے ایک ایک جھونپڑے میں دیکھنے کو ملی۔ پہاڑی آبادی میدانی علاقوں سے کتنی مختلف تھی۔ چمبہ کے گدّی چرواہے جو ترانے چھیڑتے تھے وہ صرف پہاڑوں اور وادیوں میں گونج کر ہی رہ جاتے ہوں' یہ بات نہ تھی؛ اُن کے گیت کھیتوں کی طرح سادہ اور گھر کی روٹی کی طرح اچھے تھے۔ اور گدیوں کی حبّ الوطنی کا تو میں جھٹ قایل ہو گیا" بھگوان مجھے اگلے جنم میں بھیڑ یا بکری بھی بنائے تو وہ مجھے چمبہ کے علاقہ میں دھولی دھار کی پہاڑیوں کے قریب ہی جنم دے تو بہتر ہو" ان الفاظ کے ساتھ گدیوں کا ترنّم دلوں تک پہنچ سکنے کا عادی تھا۔ دھرم سالہ اور پالم پور کی سیر بھی کافی دلچسپ رہی۔ پھر منڈی ہوتا ہُوا کُلّو پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرا قلم ذرا زور سے چل رہا ہے، فوٹوگرافی کا شوق الگ اُبھر رہا تھا۔ کُلّو سے میں پیدل شملہ پہنچا اور پھر شانتی نکیتن ہوتا ہُوا سیدھا آسام پہنچ گیا۔

آسام میں میری توجہ کھینچنے کے لئے کافی سامان تھے مگر تھا تو میں ایک ہجر رسیدہ خاوند ہی۔ گیت لکھتے لکھتے کبھی گھر کا خیال آجاتا، تو دل پیچھے ہٹتا نظر آتا۔

پتا جی کا خط آتا تو دِل کی مضبوطی اور بھی ہاتھ سے نکل جاتی۔ بیوی کا خط الگ آتا۔ شروع شروع میں ان سب کا لہجہ اُداس کرنے والا نہ تھا، بعد میں ان کا پُرسوز انداز برداشت کی چیز نہ رہی۔ مَیں نے جواب دینا چھوڑ دیا۔

میری ڈاک پہلے گوہاٹی میں سدانند کے پاس پہنچتی اور پھر جہاں کہیں میں ہوتا مجھ تک لوٹائی جاتی۔ مَیں نے سدانند کو لکھ بھیجا کہ وُہ پُورے ایک ماہ تک میری ڈاک اپنے پاس روک کر پھر میرے پاس بھیجا کرے۔ پتا جی نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ بیوی برابر لکھتی رہی اور مَیں اُس کے چار چار خطوں کا جواب ایک ہی خط میں بھیجتا۔

پھر میں نے دیکھا کہ میری بیوی خط کے ساتھ لفافہ میں کچھ گیت بھی لکھ بھیجنے لگی ہے۔ مَیں نے سوچا، یہ اچھی بات ہوئی۔ اب برہن کے دِیے والا گیت وہ اپنے قلم سے ایک دن ضرور لکھ بھیجے گی۔ مگر دوسرے گیت پہنچتے رہے، وہ گیت، جس کا انتظار تھا، جس کے لئے دِل بیقرار تھا، نہ پہنچا۔

آخر بہت انتظار کے بعد برہن کے دِیے والا گیت بھی آ پہنچا۔ پہلے کی طرح اب کے لفافہ میں خط نہ تھا۔

اگلی صبح ہی مَیں نہنی پور ریاست کو خیرباد کہہ کر گوہاٹی کے لئے چل پڑا۔ سدانند کو مَیں نے "دِیا جلے ساری رات" گیت کی کہانی سنائی۔ وہ شاید

اسے سمجھ ہی نہ سکا، یوں ہی مسکرا دیا۔ اُسے مُسکراتے دیکھ کر مجھے بھی ہنس دینا پڑا۔
پُورے ڈیڑھ برس بعد میں گھر لوٹا۔ مجھے اُمید تھی کہ اب میری بیوی مجھے اپنی زبان سے برہن کے دیے والا گیت ضرور سُنا دے گی۔
مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "اس پُورے ڈیڑھ سال میں برہن کا دِیا جلا کر پریتم کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ اب پریتم گھر آیا ہے۔ اب میں کوئی برہن نہیں ہوں، وہ گیت کیسے گاؤں؟" بات اُس کی ٹھیک تھی۔ اور میں اگر سوال جواب پر اُترتا بھی تو کس برتے پر؟
پچھلے ہفتہ میں ایک دوست کے ساتھ سیر کرنے نکلا تو مجھے اپنی کہانی کا یہ ورق یاد آ گیا "دیا جلے ساری رات"، یہ خیال میرے دِل پر چھا گیا۔ ۔ ۔ بے رحم پریتم! تم آتے ہی نہیں، رات بھر میرا دِیا جلتا رہتا ہے! ۔ ۔ ۔ نہ جانے کتنی بتیاں جل جاتی ہیں! ۔ ۔ ۔ تم آتے ہی نہیں، بے رحم پریتم! ۔ ۔ ۔ میرے دوست کو یہ گیت بہت پسند آیا۔ میں نے کہا "مٹی کے دیے کو حقیر نہ سمجھنا۔"
مجھے رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک خیال یاد آ گیا۔ "غروب ہوتے ہوئے آفتاب نے کہا — 'کیا کوئی ہے جو میرے بعد میرا کام کر سکے؟' مٹی کا دِیا سر اُٹھا کر کہنے لگا — 'میں کوشش کروں گا!'"

کل رات جب میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ میں نے اپنی کہانی کا یہ ورق لکھنا شروع کر دیا ہے تو وہ بول اُٹھا۔ "دیکھنا، یہ ظلم نہ کرنا میں تو خود برہن کے دیے کا سہارا پا کر ایک نظم لکھ رہا ہوں۔"

میں نے زور دے کر کہا "تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ تم بھی لکھو، میں بھی لکھوں گا۔"

"تم لکھو گے تو میں اپنی ادھوری نظم تمہارے روبرو ہی پھاڑ دوں گا۔"

"میں لکھوں بھی تو تمہاری نظم کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے کا، دوست، اُلٹا مقابلہ میں آ کر تمہاری نظم اور بھی چمک اُٹھے گی۔"

"نہیں بھائی نہیں۔ میں یوں نہیں ماننے کا۔"

میں نے اُسے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا "اچھا میں نہیں لکھوں گا۔"

خوش ہو کر وہ 'دِیا جلے ساری رات' پر پُورے آدھ گھنٹہ تک تقریر کرتا رہا۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح کالج میں کوئی پروفیسر نظم پڑھا رہا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اُس عورت کا گیت ہے جس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی انتظار کی گھڑی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کہہ رہا تھا اور میں بغور سُن رہا تھا میں سوچ رہا تھا، کیا کوئی گیت لیکچر کا محتاج ہو سکتا ہے؟

مگر اور تو اور، میرے دوست کی نظم کا اب کیا حال ہوگا؟ میں نے تو اپنا دِیا جلا ہی دیا ہے۔ اچھا ہو اگر میرے دوست کا دِیا بھی جلے۔ میں ڈرتا ضرور

ہوں، کہیں وہ مجھے اپنے وعدے سے پھرا دیکھ کر یہ نہ کہہ دے" لو بھئی یہ ہے میری نظم۔ اسے تم اپنے ہی ہاتھوں سے پھاڑ ڈالو۔"

آسام کے سفر کے بعد بھی میں وہی پرانا مسافر ہوں۔ پنکھ نہیں تو نہ سہی، دل تو ہے؛ اور پاؤں میں چکّر کا زور بھی ہے۔ اب میری بیوی میرے ساتھ رہتی ہے۔ خانہ بدوشی ہی میں ہمیں ایک تیسرا ساتھی بھی مل گیا ہے؛ وہ ہے "کویتا" ہماری لڑکی۔

برہن کے دیئے والے گیت سے کہیں اچھے گیت سننے کو مل چکے ہیں۔ پھر بھی دل ہے کہ اسی مٹی کے ٹمٹماتے دیئے کی طرف دوڑتا ہے نہ میں ہجر رسیدہ ہوں، نہ میری بیوی۔ پھر بھی ہم دونوں نہ جانے کیوں اُس گیت کو گانے لگتے ہیں؟

عرصے سے سدانند نہیں ملا۔ بہت تلاش کی ہے، وہ مل جائے تو اُسے ہم دونوں یہ گیت گا کر سنائیں۔ تب میں اُس سے پوچھوں، کہ آسام میں وہ برہن کے دیئے سے متعلق میری کہانی سُن کر مُورکھ کی مانند کیوں ہنس دیا تھا؟

۷

اِیراوَتی

شام کی سُرخی آسمان پر اور دھرتی پر خاموش ایراوتی۔ یہ نظارہ مجھے مگن رکھتا ہے۔ چت لیٹی ہوئی ریت پر میں بھی لیٹ جاتا ہوں۔ سو نظاروں کا ہے ایک نظارہ — ایراوتی کا کنارہ۔

صدیوں سے وہ یوں ہی بہہ رہی ہے۔ وُہ اِس دیس کی ماں ہے۔ لوگوں کے قہقہوں کی امانت دار ہے۔ اُن کی تاریخ اُسے یاد ہو گئی جیسے کہہ رہی ہو، مَیں نے ہی انہیں ہنسنا سکھایا ہے۔ یاد نہیں آ رہا کہاں پڑھا تھا کہ خوشی اور غم کے جذبے ہم میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ کوئی اُنہیں الگ

الگ نہیں کر سکتا۔ کب اور کیسے وُہ ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں،
کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سوچتا ہوں کہ ان لوگوں نے اِن جذبوں کو الگ الگ
کرنا سیکھ لیا ہے۔ جدھر نگاہ اُٹھاؤ، ہنستے ہوئے چہرے۔ لوگ تو میں نے
بہت دیکھے بھالے ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اِتنے خوش لوگ
پہلے دیکھے بھی ہوں تو یاد نہیں آ رہے۔ اِتنی بھی کیا خوشی ہے؟

بادبان کی طرح بازو پھیلا کر میں ناچنے لگتا ہوں۔ پھر ریت پر خود ہی
گر پڑتا ہوں۔ صدیوں سے ریت یہاں موجُود رہی ہے۔ صدیوں سے ایراوتی
آدمی کو شانتی دیتی آئی ہے۔ یہ فضا مجھے پسند ہے۔ زندگی ہونی چاہئے ندی
کی طرح، کھُلی اور آزاد ایراوتی کی طرح۔

اچھا ہوتا کہ رنگون سے مانڈلے تک ایراوتی کے پانیوں پر سفر کیا ہوتا۔
اس میں پُورے سات دن لگ جاتے ہیں۔ مگر میں ریل کے راستے یہاں
پہنچا۔ اور ایراوتی کو پہلے پہل میں نے یہیں دیکھا۔

کاکا کالیلکر کے الفاظ میرے ذہن میں گونج اُٹھتے ہیں "ایراوتی کہیں
یا اَیراوتی؟ میری سمجھ میں اِس کا نام "اِرا" نام کی گھاس پر سے ایراوتی پڑ
گیا ہے۔ اس کے کناروں کی قوّت بخش گھاس چرنے والے ہاتھی کو
ہی ایراوت کہتے ہوں گے۔ یا پھر اِندر کے ایراوت کی طرح بڑے ڈیل ڈول
والی اور مست ہاتھی کی چال سے چلنے والی اِس ندی کو دیکھ کر کسی بودھ

بھکشو کو یہ بات سُوجھی ہو گی ــ بس اِس کو ہم اَیراوتی کہیں گے.... ایراوتی کہیں ہندوستان میں ہوتی تو سنسکرت کے شاعروں نے اس کے بیان میں ایراوتی جتنی ہی لمبی چوڑی ندی بہا دی ہوتی...[1]"

سبھی ندیاں پہاڑوں سے نکلتی ہیں اَور وادیوں اور میدانوں کو پار کرتی ہوئی سمندر کی طرف بھاگی چلی جاتی ہیں۔ ایراوتی بھی دُور پہاڑوں سے آتی ہے۔

ایراوتی کا نکاس یہاں سے کتنی دُور ہے؟

سات سَو میل۔

تو گویا یہ تیرہ سَو میل لمبی ندی ہے؟

جی ہاں۔

پہلے پہل ایراوتی پہاڑوں کی گود سے نکل پڑی تھی تو کیا جانتی تھی کہ آگے چل کر "مانی کا" اور "مالکہ" اُسے اپنا پانی دے کر دُور دراز سفر پر دھکیل دیں گی ــ تیرہ سَو میل دُور۔ شروع میں کوئی بھی دریا یہ جاننے کی پروا نہیں کرتا کہ اُسے کتنی دُور جانا ہے۔ وہ بہنے لگتا ہے، یہی زندگی ہے۔

دُور سے کسی کے گریت کی آواز مجھ تک پہنچتی ہے۔ جیسے ایراوتی کہتی ہو ــ یہ گیت اَور کہاں ملیں گے؟ سچ کہتی ہے۔ ابھی کیا جلدی ہے؟

[1] "لوک ماتا" (گجراتی)

پھر بیٹھ جاتا ہوں۔

خدا حافظ، ایراوتی! کل پھر سہی۔

مَیں ایراوتی سے اتنا متاثر ہوتا ہوں، پر کیا خود بھی ایراوتی کو متاثر کر سکا ہوں؟ پاؤں تیزی سے نہیں اُٹھتے۔ جانا تو ہوگا۔ قیام گاہ پر میزبان انتظار میں ہوگا۔ ایراوتی کچھ نہیں بولتی۔ بولے بھی کیا؟

۲

اُشا کا نظارہ بھی مجھے مگن رکھتا ہے۔ اب سدانند بھی میرے ساتھ ایراوتی کے کنارے چلا آتا ہے۔ وہ بھی میری طرح ایک آوارہ پرندہ ہے۔

ایراوتی گنگنا رہی ہے۔

جو کہنا ہے سب کچھ کہہ لے، ایراوتی!

سدانند کہتا ہے ــ "آراکان" اور "پیگو یوما" کے پہاڑ ایراوتی کے پُرانے سنتری ہیں۔"

مَیں کہتا ہوں، "سب پہاڑ دھرتی کی خودداری کے ترجمان ہیں۔ آراکان اور پیگو یوما بھی۔۔۔۔ ٹیگور نے کہیں لکھا ہے "گیت الاپتا ہوا دریا تیز دوڑتا ہے ــ سب رُکاوٹوں کو پھاندتا ہوا۔ پر پہاڑ دریا کی یاد میں کھویا کھویا سا کھڑا رہتا ہے اور اُس کا پیار دریا کی طرف لپکتا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔

مَیں تو سمجھتا ہوں کہ آراکان اور پیگو یوما دونوں ہمیشہ ایراوتی کے پیار میں

اسی طرح کھوئے ہوئے سے کھڑے رہیں گے"۔
رنگون کی طرف جانے پر پہلے کونسا مقام آتا ہے؛

امراپور۔
امراپور کے بعد؛
آبھا۔

امراپور اور آبھا تاریخی شہر ہیں۔ ان کے بعد "من جی آن" بندرگاہ آتی ہے۔ یہ وادی کسی زمانے میں میدانِ جنگ رہ چکی ہے۔ پھر "کوکوچو" شہر سے چند میل پرے چھندوِن ندی ایراوتی میں ملتی ہے۔ شان لوگوں کے علاقے سے آنے والی چھندوِن ایک غریب عورت کی طرح اپنا آپ لٹا دیتی ہے اور ایراوتی ٹھہری پکّی سرمایہ دار! پھر پگان آتا ہے۔ یہ پرانا شہر ہے۔ ہزاروں پگوڈوں[1] کے کھنڈرات اس کی تاریخی حیثیت کے امانت دار ہیں۔ اس کے بعد سٹیمر "ناؤں لا" کے مقام پر رکتا ہے۔ قریب ہی مٹی کے تیل کے کنوئیں ہیں۔ انگریز اور امریکن سرمایہ داروں نے اس سے بہت روپیہ پیدا کیا ہے۔ پھر سٹیمر بڑے پُرسکون علاقے سے گزرتا ہے۔ اُونچے اُونچے پہاڑ خاموش اور سنجیدہ بزرگوں کی طرح کھڑے ہیں۔ ساری فضا کسی گہرے خیال میں کھوئی کھوئی سی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد

[1] پیگوڈہ = بودھ مندر

سٹیمر بالترتیب "من چو" "جائے ٹامیو" اور "پروم" پہنچتا ہے۔ پروم کے بعد ایراوتی کئی شاخوں میں بٹ کر سمندر سے جا ملی ہے۔

سدانند سے کئی بار جھگڑ چکا ہوں۔ اُسی کی وجہ سے میں ریل کے راستے یہاں پہنچا۔ آگے کا سفر ریل میں طے کرنے سے باز آیا۔ یوں ہمارا سفر بدمزا نہیں رہا۔ ہر چھوٹے بڑے سٹیشن پر ہم دو دو تین تین دن ٹھہرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ تعارفی چٹھیوں کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ رنگون سے تو اگلے سٹیشن کے لئے ہی ایک چٹھی ملی تھی۔ جب ہمارے میزبان نے مہمان نوازی کا جوہر دکھایا تو میں سمجھ گیا کہ چٹھی میں ہماری سچی جھوٹی تعریف کے پُل باندھے گئے تھے، اور یہ مہمان نوازی ہر مقام پر نصیب ہوئی۔

سدانند سنیاسی ہے۔ اُس کا ادب مجھے ملحوظ ہے۔ سوچتا ہوں کہ وہ سنیاسی کیسے بن گیا۔ وہ مشرقی بنگال میں ایک دریا کے کنارے پیدا ہوا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ اُس دریا سے اُس کا بچپن اُسی طرح وابستہ تھا جیسے اب میں ایراوتی سے وابستہ ہو رہا ہوں۔ اور پھر ایک طرح کی آوارگی کے خیال نے اُسے گھر چھوڑنے کے لئے اُبھارا تو وہ چل نکلا۔ مگر وہ سنیاسی کیسے بن گیا؟ تلاشِ حق کے لئے؟ نہیں تو۔

کسی ندی کے نکاس تک ہو آنا تلاشِ حق سے کم وقعت نہیں رکھتا۔ ٹھیک کہتے ہو۔

یہاں سے بھامو تک کتنے دن کا راستہ ہے؟

تین دن کا۔

ایراوتی کا پاٹ تنگ ہونے لگتا ہے۔ کناروں پر ساگوان ہی ساگوان نظر آتے ہیں۔ گھنے جنگل ہیں۔ پرے پہاڑ سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ ٹیگور نے کہیں لکھا ہے ــ" درخت، جو دھرتی کی بے قرار تمنائیں ہیں، پنجوں پر کھڑے آسمان کو جھانک رہے ہیں!" کیا اس دیس کے ساگوانوں پر بھی یہ بات لاگو ہوتی ہے؟ یہ درخت تو کاٹ ڈالے جاتے ہیں، کوئی پہلے کوئی پیچھے! کوئی ان کا غمگسار نہیں، ہمدم نہیں۔ مانڈلے کے بعد "سن گن" اور "تھابی ٹاکن" شہر آتے ہیں۔ پھر "موپک" جہاں لعلوں کی کانیں ہیں۔ آگے بھامو ہے، اس سے آگے سٹیمر صرف برسات میں جاتا ہے اور وہ بھی "مٹ کنا" تک۔ بھامو سے مٹ کنا تک سمپان[1] بھی ملتی ہے۔ مگر پانی تیز ہے اور بہاؤ کے اُلٹ جانا آسان نہیں۔ مٹ کنا سے موٹر ملتی ہے۔ یہاں سے آٹھ میل پر "مائی کا" اور "مالکہ" ندیاں ایراوتی میں گرتی ہیں اور ایراوتی کا نکاس بھی قریب ہی رہ جاتا ہے۔

سٹیمر کے پانی کاٹنے کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔ جی چاہتا ہے، آج ہی ایراوتی کے نکاس کی طرف چل دوں۔ سدانند مانتا نہیں۔

[1] دیسی کشتی

سٹیمر سیٹی دے رہا ہے۔

چلو ٹکٹ لے لیں، سوامی جی!

آج نہیں۔

مجھے غصہ آ رہا ہے۔ ہر روز "آج نہیں" کی رٹ! اُس کے پاس کرایہ نہیں، پیسے میرے پاس بھی مشکل سے ایک ٹکٹ کے ہوں گے مگر کہیں درمیانی مقام کے دو ٹکٹ لئے جا سکتے ہیں۔ چلیں تو سہی۔ آگے دیکھا جائیگا۔ سیٹمر کی سیٹی سُنتا ہوں تو بے چین ہو جاتا ہوں۔ سدانند کی صلاح بغیر میں قدم نہیں اُٹھا سکتا، یہ وہ جانتا ہے۔

سنیاسی تو بغیر ٹکٹ کے بھی سٹیمر میں سفر کر سکتا ہے!

میں ایسا سنیاسی نہیں۔

پیسے کا تعلق سفر سے اُسی طرح ہے جیسے بھاپ کا سٹیمر سے۔ ایسے سادھو سنیاسی، تو ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں جن کا نصب العین صرف بھیک مانگنا رہ گیا ہے۔ مگر سدانند تو ایک طرح کا مزدور سنیاسی ہے۔ کہیں کوئی تقریر کر دی اور مزدوری پہلے کھری کر لی۔ مگر کوئی کوئی انجمن بعد میں دھتا بتا دیتی ہے۔ یا بوقتِ ضرورت کوئی انجمن پیسے دے کر تقریر کرانے پر تیار نہیں ہوتی۔ میرا اپنا حال بھی سدانند سے بہتر نہیں۔ کلکتے کے ایک رسالے کو مضمون بھیجا تھا۔ ابھی تک اُس کی مزدوری نہیں آئی، اور اب تو

یہ شک ہو رہا ہے کہ وہ ناپسند نہ قرار دے دیا گیا ہو۔ ناپسند سہی۔ اطلاع تو پہنچے
اُمید کہتی ہے شاید کل ہی منی آرڈر آ جائے۔

اپنی تنگ دستی کو سدانند بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔
سوچتا ہوں کہ خانہ بدوش ادیب اور مزدور سنیاسی سے تو ایراوتی کے ملّاح
ہی آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایراوتی گنگنا رہی ہے۔ شاید وہ میرے
خیال کی تائید کر رہی ہے۔
ہر شخص کا وجود اپنی جگہ ضروری ہے۔ یہ بے اعتنائی تو کسی طرح جائز
معلوم نہیں ہوتی۔ آخر کیوں بعض لوگوں کی زندگی بیکار اور بے لطف بنا
دی جائے؟ روزمرہ کی زندگی میں امیر اور غریب کے درمیان ایک خلیج
کیوں حائل ہوتی چلی جا رہی ہے؟ کب بدلے گی سماج کی حالت؟ سدانند
مسکرا رہا ہے۔ اُس کی دُور رس نظر نئے زمانے کو قریب آتے دیکھ رہی ہے
یہ سب کچھ دیکھ کر اُس کے ذہن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی سوال پیدا ہوتا رہتا
ہے اور پھر شاید وہ خود ہی اپنے دل سے اس کا جواب پا لیتا ہے۔
ایراوتی ہر نئے زمانے کا استقبال کرتی آئی ہے۔ وہ بہتی رہی ہے بہنا
ہی زندگی ہے۔ اُس میں طوفان بھی آئے ہیں۔ اور اب کے سماج میں بھی
ایک بڑا طوفان آکر رہے گا۔ گھناؤنی رجعت پسندی کی جڑیں اُکھڑ جائینگی۔
کوڑا کرکٹ بہہ جائے گا۔ اور پھر شاید ایراوتی کے پانیوں پر لوگوں کے

آنسو کبھی نہیں گریں گے۔

۳

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں جب زندگی سمٹ جاتی ہے، ملاحوں کے گیت ہم پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ بادبان کی طرح بازو پھیلا کر سدانند بھی کنارے کنارے بھاگنے لگتا ہے۔ پھر وہ خود ہی گر پڑتا ہے۔ ریت پر چت لیٹ جاتا ہے۔

پُرانی کتابوں میں سنیاسی کے لئے یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ ایک مقام پر زیادہ نہ ٹھہرے۔ کہیں کہیں تو شاید یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایک رات سے زیادہ نہ رُکے۔ سدانند اس کا پابند نہیں۔ آخر یہ پابندیاں کیوں لگائی گئی تھیں؟

سٹیمر سیٹی دے رہا ہے۔

چلو ٹکٹ لے لیں۔ اب تو روپے بھی آ گئے۔

اتنی کیا جلدی ہے؟

سنیاسی کو کسی مقام سے اِتنی دل بستگی نہ ہونی چاہئے۔

مَیں ایسا سنیاسی نہیں۔

مگر حق تو یہ ہے کہ مجھے بھی ایراوتی کے اس کنارے سے دِل بستگی ہو گئی ہے۔ یہاں کتنا سکھ چین نصیب ہوتا ہے! اب تو جی چاہتا ہے کہ بھری

دوپہر کا وقت یہیں آکر کاٹا کروں۔

کوئی گاتا ہے:

"تُم ٹھہروگے نہیں؟

ہماری باتیں سنو گے نہیں؟

ہم ہیں ایراوتی کی لہریں!"

دن کا وقت ہوتا، تو مَیں ملاح کا چہرہ دیکھ سکتا اور اندازہ کر سکتا کہ وہ لہروں کے بول سُن کر کتنا متأثر ہُوا ہے۔

"پانی سے بھرے ہوئے بادل ابھی برس پڑیں گے

منجدھار تو ابھی پار کرنا ہوگی!"

مجھے یاد ہے کہ ایک پُرانے مُلکی ناچ میں اِس دیس کی کنواریاں بازو ہلا ہلا کر چپّو چلانے کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ اُن کے چہروں پر خوف چھایا ہُوا تھا ــ کشتیاں منجدھار میں تھیں اور سر پر بارش کھڑی تھی۔

موسیقی کی ترنگ تیرتی ہوئی نہ جانے کہاں تک چلی جاتی ہے:

"ایراوتی کی لہروں کی طرح

میری محبوبہ آزاد ہے!"

صدیوں سے اِس دیس کی عورت آزاد ہے۔ مرد نے اُس کی آزادی اور خوشی پر چھاپا نہیں مارا۔ اکثر وہ اپنے خاوند کی وفادار رہتی ہے جب

دیکھتی ہے کہ وہ اُس کی طبیعت کے مطابق نہیں رہا تو گاؤں کی پنچایت کے سامنے کھڑی ہو کر صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ آئندہ اُس کی بیوی بنی رہنے کی پابند نہیں رہ سکتی۔ والدین سے ملی ہوئی جائداد پر اُسی کا حق رہتا ہے اور وہ جسے پسند کرے اُس سے دُوسری شادی کرلے۔

ملّاحوں کے گیت پہلے بھی بہت سُنے ہیں۔ یہ بھی نہ بھولیں گے:

"ایراوتی، اری او میری ایراوتی!

او میری محبوب ایراوتی!

اور سب ندیاں پیاری ہیں —

سب سے پیاری ہے ایراوتی!"

۲

"دن بھر میں ناؤ کھیتا ہوں

تیرے پانیوں پر او ایراوتی!

ملّاح کی زندگی ہے بجائے خود ایک گیت

تیرے پانیوں پر او ایراوتی!"

۳

"سُندر کنواریاں ناچ رہی ہیں، جھوم رہی ہیں

تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے۔

تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا؟
بتاؤ بتاؤ، ایراوتی کی بیٹیو!

ہم ہیں مور اور تم ہو مورنیاں
مور مار ڈالے جائیں گے اور تم رویا کرو گی۔
دریا کے اس موڑ پر یہ ناچ سیکھا تھا یا اس پہاڑ پر
جہاں سے ایراوتی نکلتی ہے،
تم نے یہ ناچ کہاں سیکھا؟
بتاؤ بتاؤ، ایراوتی کی بیٹیو!"

۴

"ایراوتی میں ہمارے آنسو سما تے رہے ہیں، بھائیو!
ایراوتی کتنی میلی ہو رہی ہے،
اور جب غریبی ہمارے گلے گھونٹ دے گی
ایراوتی اسی طرح بہتی رہے گی"

۵

"بہتی جا، ماں ایراوتی، بہتی جا
تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے۔
ایراوتی! تو چپ کیوں ہے؟ اداس کیوں ہے؟

ہمارے آنسو شوق سے پیئے جا۔
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم ہیں تیرے بیٹے
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تُو ہے ہماری ماں
بہتی جا، ماں ایراوتی، بہتی جا
تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے"۔

ایراوتی گنگنا رہی ہے۔ شاید اپنے بیٹوں کو آشیرباد دے رہی ہے۔ اُس کی گنگناہٹ سے متاثر ہو کر میری ڈانواڈول طبیعت میں توازن آ گیا ہے، ایک خاص طرح کی وسیع النظری بھی۔ میرا ذہن، جو چند مہینوں سے پورا کباڑخانہ بنا ہوا تھا۔ غیر ضروری اور انٹ شنٹ چیزوں کا بے ترتیب مال گودام۔ اب بہت صاف ہو گیا ہے۔ یہاں بیٹھ کر نئے نئے خیالات سوجھتے ہیں۔ رُوح ذی حس ہو رہی ہے اور ہلکے ہلکے سے تاثرات بھی اُس پر ایسی پائدار تصویریں کھینچ رہے ہیں جو شاید رہتے دموں تک بنی رہیں گی۔ اور سدانند بھی جیسے میرے ذہن میں بیٹھ کر یہ سب تصویریں دیکھتا رہتا ہے۔ اپنا گول مٹیالا سر ڈھلکا کر وہ کبھی ایراوتی کے اُس پار دیکھنے لگتا ہے اور کبھی میرے سر کے لمبے اور اُلجھے ہوئے بالوں کی طرف جن کی لہریں شاید دھان کے اُن پودوں کا نظارہ پیش کیا کرتی ہیں جنہیں ہوا تھپکیاں دے رہی ہو۔

صدیوں سے وہ یوں ہی بہہ رہی ہے۔ وہ برما کی ماں ہے۔ میں اُس سے اِتنا متاثر ہوتا ہوں پر کیا خود بھی اُسے متاثر کر سکا ہوں؟ خدا حافظ، ایراوتی! کل پھر سہی۔

اُٹھو، سوامی جی، اب گھر کو چلیں۔

اتنی کیا جلدی ہے۔

۸

مامُونیٔ

"آج تو دِل چاہتا ہے کہ کِسی غمناک گیت کا رَس لیا جائے۔ یوں گیت تو سبھی اپنی اپنی جگہ دل کی سِمٹی ہوئی دُنیا میں جذبات کی لہریں پَیدا کر دیتے ہیں، مگر غمناک گیتوں کی بات ہی کچھ اَور ہے ۔۔ انہیں گانا ہو تو سوز کی ضرورت پڑتی ہے، نِرے ساز کی نہیں۔ زندگی میں غم ہے بھی زیادہ۔ تب غم کے گیت ہمیں کیوں نہ پسند آئیں؟ ۔۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے مَیں اپنے پٹھان دوست کے سامنے بیٹھ گیا۔ میرے کام میں اُسے دِلچسپی تھی۔ پچاس سے اُوپر گیت، جو اُس کے ذریعہ میرے

مجموعے میں آئے تھے، مجھے بہت پسند تھے۔

وہ پشاور کے اسلامیہ کالج میں طالب علم تھا۔ پہلے پہل میں اُس کے ہوسٹل کے کمرے میں جا کر اُس سے ملا تھا۔ وہ اُس وقت کھانا کھا رہا تھا۔ بولا ــ "دسترخوان تا مے نگورا تندی تا مے گورا" ــ یعنی "میرے دسترخوان کی طرف مت دیکھ، میری پیشانی کی طرف دیکھ"۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کا تعلق پٹھانوں کی مہماں نوازی سے ہے۔ ہر میزبان اپنے مہمان کو یہی کہے گا کہ اُس کا دسترخوان اُس کی غریبی کا ترجمان ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مہماں نوازی سے منہ موڑ لے گا۔ وہ خوش ہے اور اُس کی پیشانی پر اس خوشی کا نور دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بے تکلفی نے میری بھوک چمکا دی، اور اُس دن نہ صرف مجھے گیت ہی ملے جن کی تلاش میں وہاں پہنچا تھا، بلکہ مہماں نوازی کا بھی نیا تجربہ ہوا۔

"غناک گیتوں کا شوق تو مجھے بھی ہے، اچھا، ٹھہریئے۔ میں ہوسٹل کے گیٹ کیپر کو بُلاتا ہوں۔ وہ ایک بُڈھا آفریدی ہے۔ وہ مل جائے تو مزا آ جائے۔" یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

وہ اکیلا ہی واپس آیا۔ بولا "وہ آفریدی ملا نہیں، اطمینان رکھیے۔ اُس نے کہاں جانا ہے؟ یہیں کہیں ہوگا۔ میں نے اپنے ایک دوست کو کہا ہے کہ وہ اُسے تلاش کر کے میرے کمرے میں بھیج دے۔ وہ آ گیا تو جی

پھر گیت سُن لیجیے۔"
کمرے کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے سگرٹ کا لمبا سا کش لگا کر کہا "غم! ہاں، زندگی میں غم نہ ہو تو ہماری خوشی کا شاید کچھ مطلب ہی نہ رہ جائے .... غم میں نے بہت نہیں دیکھا۔ مگر میں اس کی قیمت سمجھتا ہوں۔ تبھی تو غم کے گیت مجھے بھی اچھے لگتے ہیں .... شیلے بھی تو یہی کہتا ہے۔"
"دنیا کی بہت ساری شاعری غم کی شاعری ہے۔"
"بجا ہے۔"
"ہکسلے نے ٹھیک ہی تو لکھا ہے کہ جب آدمی کی دنیا میں دکھ، نا اُمیدی اور تڑپ اُونچ نیچ پیدا کرنے سے رہ جائیں گی، تب آدمی کے پاس کہنے سُننے کو اور گانے کو کچھ نہ رہ جائے گا اور ہمارا ادب بانجھ ہو جائے گا۔"
"دھرتی کی شاعری زندگی اور موت کی شاعری ہے، اور میں تو سمجھتا ہوں کہ سُکھ اور دُکھ اِس کے دو کنارے ہیں۔"
"مجھے اس وقت ٹیگور کی ایک نظم یاد آ رہی ہے۔ ایک آدمی مدت تک سُورگ میں رہا اور پھر اُس کے نیک اعمال مدھم پڑ گئے۔۔ اُسے دھرتی پر لوٹ آنا پڑا۔ نظم کا نام ہے "سُورگ سے الوداع"۔ سُورگ چھوڑتے وقت یہ آدمی بہت گھبرایا۔ وہاں وہ آنسو دیکھے گا؟ اُسے یہ اُمید نہ تھی۔ سُورگ تو خوشی کا مقام ٹھہرا۔ وہاں دُکھ کا کیا کام؟ وہ سوچنے لگا کہ اگر سُورگ پر

دُکھ کا سایہ پڑ جائے تو اُس کی خوبصورتی کتنی بدل جائے، روشنی میلی ہو جائے، ہوا میں اُداس سُر سما جائیں، ندی بہتی بہتی اُداس نغمہ پیدا کرتی چلے، روشن دن کے بعد شام کی لالی ظاہر ہو۔ پر سُورگ میں یہ سب نہیں ہونے کا۔ یہ جُدا جُدا رنگ تو دھرتی کے حِصّے میں آئے ہیں۔ آنند وہاں تڑپ سے مِلا ہُوا ہے اور تبھی وُہ اتنا خوبصورت ہو گیا ہے۔ سُورگ کی اپسرا پریم تو کرتی ہے، پر اُسے کبھی کوئی ٹیس نہیں اُٹھتی۔ نہ اُسے کبھی کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ہجر میں جو انتظار رہتا ہے وصل کا، وہ اُسے کیا جانے؛ دھرتی پر ہجر اور وصل کے ذریعہ عشق پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے...... اور ساتھ ہی مجھے براؤننگ کی وُہ نظم بھی یاد آ رہی ہے جس میں ایک آدمی بہشت سے لوٹ کر اپنے دوستوں کو بتا رہا ہے کہ اِس دھرتی پر زندگی بہت سُندر ہے۔ وہ کہتا جاتا ہے —
نہ بہشت میں کسی چیز کی کمی ہے، نہ وہاں کچھ ترقی ہی ہوتی ہے، نہ اول بدل ہے، نہ شروع ہے نہ آخر۔ اچھے بُرے میں وہاں کوئی تمیز نہیں۔ سبھی تو ایک سے سُکھی ہیں وہاں۔ کوئی دُکھی نہیں۔ سبھی مکمل ہیں۔ میں تو اس سے گھبرا اُٹھا۔ پھر میرے من میں محبت اور نفرت کا، اُمید اور یاس کا بھیڑا سا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں دُنیا کی زندگی کے لئے للچا اُٹھا۔ میں چاہتا تھا جُدا جُدا رنگ۔ سب کچھ یکساں دیکھنے سے میں اُوب گیا تھا۔ اُونچ نیچ والی لا انتہا زندگی میں تفرقوں کے بیچوں بیچ ایک یگانگت دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے

آدمی کے دِل کو۔ او آدمیو! تمہیں شک ہوا کرتا ہے، اُمید بھی اور ڈر بھی تمہارا دِل چھُوا کرتے ہیں۔ تم مرتے بھی ہو تو کیا حرج ہے؟ زندگی کا مقصد نظر سے اوجھل تھوڑا ہی ہو جاتا ہے۔ میرے دِل میں یہ خیالات جاگ اُٹھے تو ایک فرشتے نے مجھے بتایا: ارے اور لفن! یہاں کا تمہارا وقت ختم ہوتا ہے۔ اب تمہاری جگہ دھرتی پر ہو گی! ....."

اِتنے میں وہ آفریدی گیٹ کیپر آ پہنچا۔ "شیر گُل! آج وہ ماموُنی کا گیت سُنا دو نا۔ دیکھو انکار نہ کر دینا" میرا دوست بولا۔

"بس ایک گیت؟ بس ایک ہی؟ ...."

"بس ماموُنی کا گیت"

"ماموُنی کا ہی کیوں؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آج ماموُنی کا گیت ہی ہو جائے"۔

گیٹ کیپر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔ شاید گیت کے الفاظ کو اپنے ذہن میں ٹھیک طور سے بٹھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خواب کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وُہ گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔

مَیں نے پُوچھا "ماموُنی کیا ہوئی"؟

میرا دوست بولا "ماموُنی ایک عورت تھی، بے چاری بے گناہ تھی ....."

"اُس پر کیا مصیبت آ پڑی تھی؟"

"بے چاری کو شیر عالم نے مار ڈالا!"

"شیر عالم نے؟ ..... وُہ کون تھا؟"

"وہ اُس کا خاوند تھا۔"

"آخر کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"اُسے یہ شک گزرا کہ ماموئی کا چال چلن مَیلا ہوگیا ہے، اور خلیل سے اُس کی آنکھ لڑ گئی ہے۔ اِسی شک میں وُہ بھڑک اُٹھا۔ ماموئی کو اُس نے مار ڈالا۔"

پھر اُس نے گیٹ کیپر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب تو شروع کرو۔" اور پیشتر اِس کے کہ گیت شروع ہوتا اُس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ گیت "چاربیتہ" کی قسم کا ہے اور محمد حسن نامی دیہاتی شاعر نے پہلے پہل اسے تیار کیا تھا۔

گیٹ کیپر نے گانا شروع کیا:

"ت اے واگو لیجنہ اراپرے وتے دنخنہ

خار اسنہ ذرپورسے اورشو

زکالا ڑسے پ زوانئی

ارمان دے ماموئی!

ت اے پ حسن پورا: مڑ ونہ سے بصری تورا

پ زړن کې دې شولې
پ هر طرف باندې خوارې دې
پ مخ دې ستارې دي -

۱۔ سپين مخ بدن دې ہار، داګمان زبوکې زاګ
پتاسنې د لګاوو داغ، پتاسئې ډکرړ انګبرې
سنګا در پيچ شولا سخته، ت اسې دا ګلو لخته
سخني شولا در پيچه، خبر نه دې د بيچه

. . . .

خبر نه دې صنمې ګرځې، دې ويرانې
ارمان دې ماموئنې!
ت اسې د ګلو لخته . . . . . .

۲۔ خبر نه شوئې پ حاله، پ غرغ دې لوړ ملاله
تقدير ګور سيالا،
ورنه جوړا وا دا وخته، ت اسې دا ګلو لخته
خبر پ تا علم شو، چې ګل په تيغ قلم شو
ظالم پ شير علم شو
ظالما شير علما، بې ګناه کړې مرګونې

ارمان دے مائونئی !

ت اسے دا گلو لخته......

۳۔ تا چے کڑو یقین، د بل شُوئے تا بے اِین

خُپل زان دے کڑو غمگین، خپل جان دے کڑو رسوا

د چا دے س وُکڑو کمبخته، ت اسے دا گلو لخته

رُسوا شوے پ کور، دُخمنا دے شو آخور

. . . .

لُمنا درتا بکڑو، شوئے ماشوما د مائونئی

ارمان دے مائونئی !

ت اسے دا گلو لخته......

۴۔ لاشمو شان سے جاڑ ے، تُ کلی لاڑے گو آرسے

اوب د برخا لاڑے، خلیل خو تما کو ـــــ

کڑے سوال وو یئے بدبخته، ت اسے دا گلو لخته

تقدیر سے دے د تانا، کچا گرما خزانا

. . . .

سُرے شے شیرِ علما، ت پ توپ جرمنئ

ارمان دے مائونئی !

ت اے دا گلو لختہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۵۔ سُرے دجڑپ سرشے ات ٹول زیر دجبر شے
ل دے دردا ناخبر شے ، لبس کر مامد اسنا!
دغمو لو با لختہ ، ت اے دا گلو لختہ
پ لوُل ناوا گئی کے ، عندلیب زاڑی مرغان
بے ننگا شو یاران
بے ننگا زمان شو لا شہیدہ ماٹونئی
ارمان دے ماٹونئی
ت اے دا گلو لختہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گیت ختم ہُوا تو گیٹ کیپر نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا ۔ وُہ اُٹھ کھڑا ہُوا ۔ مگر میرے دوست نے اُسے جانے نہ دیا۔ "ابھی کیا جلدی ہے؟ بیٹھو" اور میری طرف سے اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ گیت کے گانے کا ڈھنگ مجھے بہت پسند ہے ۔ اُس کی آنکھوں میں بڑی ہلکی سی چمک دکھائی دے گئی اور وُہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے جذبات کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے ۔

مَیں گیت کا ترجمہ لکھنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا ۔ پہلے میرے دوست نے مجھے ایک ایک سطر کا لفظی مفہوم سمجھا دیا ۔ اور پھر مَیں نے اُس کی مدد سے

ترجمہ لکھ لیا :

"تُو پھولوں کی ٹہنی تھی۔ تو تخت سے گر پڑی
تیرا حُسن تیرے لئے آگ بن گیا
پھر جوانی میں تُو مر گئی
مائومی! مجھ پر ارمان ہے!
حُسن میں تُو پوری تھی، مصری تلواروں کے سے تھے تیرے بازو
تیری پیشانی نُورانی تھی
ہرطرف (یہ نُور) پھیلا ہُوا تھا۔
تیرا چہرہ گویا ایک ستارہ تھا۔
۱۔ چاندی (کے زیور) سا تھا تیرا چہرہ۔ بدن باز کا سا، وہ چُغل خور (تیرے اور تیرے خاوند کے درمیان) کوا بن گیا۔
اُس نے تجھ پر داغ لگا دیا اور مُخبری کی
تجھے کیسی سختی پیش آئی۔ تُو پھولوں کی ٹہنی تھی
تجھے کیسی سختی پیش آئی پیاری! اصل واقعہ کی تجھے کچھ خبر نہ تھی
تجھے کچھ خبر نہ تھی پیاری: مستانی ادا سے تُو جھوم رہی تھی۔
مائومی! تیرے لئے ارمان ہے!
تُو پھولوں کی ٹہنی تھی . . . .

۲۔ حال (کا بھید) تجھ پر روشن نہ ہوا۔ تیری گود میں تیری غمگین بچی تھی۔
اگلے روز ہی تجھے تقدیر کا تماشہ دیکھنا تھا۔
تیرے خلاف بہت دنوں سے سازش ہو رہی تھی، تو پھولوں کی ٹہنی تھی
دنیا کو تب پتہ چلا جب پھول کو تلوار سے کاٹ ڈالا گیا۔
شیر عالم ظالم ہو گیا۔
ظالم شیر عالم! تو نے ایک بے گناہ کو مار ڈالا۔
مائونی! تیرے لئے افسوس ہے
تو پھولوں کی ٹہنی تھی . . . .

۳۔ تو نے اُس (چغل خور) پر یقین کر لیا، (شیر عالم!) تو دوسرے کے تابع ہو گیا۔
اپنی جان کو غمگین کیا، اپنی جان کو رسوا کیا۔
کمبخت! کسی کا کیا بگاڑا تو نے: (مائونی!) تو پھولوں کی ٹہنی تھی۔
اپنے گھر میں تو بدنام ہوا۔ تیری بہن تیری دشمن بنی
اس نے چغلی کھائی، تو نادان بچہ بن گیا
مائونی! تیرے لئے ارمان ہے
تو پھولوں کی ٹہنی تھی . . . . . .

۴۔ اب بچوں کی طرح رو رہا ہے تو۔ تھوکے ہوئے کو چاٹنا چاہتا ہے تو۔

پانی اپنے بند سے گزر گیا۔ خلیل نے تو صرف اُس سے تمباکو کا
سوال کیا تھا، او بدبخت! (مامونئی!) تو پھولوں کی ٹہنی تھی
(بے چاری کی) تقدیر میں یہی بدا تھا، ابھی دوپہر نہ ہوئی تھی، خزاں
کا موسم تھا۔
شیرِ عالم! خدا کرے تیرے جسم میں جرمنی کی توپ سُوراخ کر دے
مامونئی! تیرے لئے ارمان ہے
تُو پھولوں کی ٹہنی تھی . . . .
۵۔ تیرے دل میں سُوراخ ہو جائے، تیرا سب کچھ برباد ہو جائے
تاکہ تُو (مامونئی کے) درد سے واقف ہو جائے۔ بس کر محمد حسن!
اب غم کے نیچے کو چھوڑ دے۔ (مامونئی!) تُو پھولوں کی ٹہنی تھی
ناواگئی گاؤں کی بُلبلیں رو رہی ہیں ——
یار لوگ بے ننگ ہو گئے
زمانہ بے ننگ ہو گیا، مامونئی شہید ہو گئی
مامونئی! تیرے لئے افسوس ہے۔
تُو پھولوں کی ٹہنی تھی . . . .''

پُوچھنے پر پتہ چلا کہ گیٹ کیپر کو مامونئی کا ایک اَور گیت بھی یاد ہے، اور
جب اُسے کہا گیا کہ وُہ دُوسرا گیت بھی سُنا ڈالے تو وہ بولا ''تب کیوں کہا

تھا۔ بس ایک گیت؟"

میرے دوست نے کہا "اس وقت ہمیں یہ تھوڑے خبر تھی کہ ماموننی کا دوسرا گیت بھی تمہیں یاد ہے۔۔۔۔ اچھا، اب دیر نہ کرو۔"

اور گریٹ کیپر نے دوسرا چار بیتہ شروع کیا :

"د دُنیا گنی دا غا دوران دئ

مڑشوا ماموننی پسے سر جا کڑے ارمان دئ

سنگا بیما خوآ، د دُنیا گنی دا غا دوران دئ

۱۔ مڑشوا ماموننی چے پر شنبیه په مثل حورا وا

خا اِست کے خاپسے رَسے، پ وطن کے مشاهورا وا

د اصل پراچ گے د باج وڑ، پ کالو پورا وا

خپل بن سپے چوگ لئ وکڑا چے مے ان پ دے یو زوان دئ

سنگا بیما خوآ، د دنیا گنی دا غا دوران دئ!

مڑشوا ماموننی پسے سر جا کڑے ارمان دئ . . . . . .

۲۔ بن پسے چو غلئ وکڑا خپل پ ردی ورتار! جما شو

را گے رائے ماموننی کڑا اُس د دے د مرگ طمع شو

دا خا اِست د حُسن ڈآرڑا ماموننی خوآرسے د غماں شو

او دے ماموننی جوڑ زماں د مرگ سامان دئ

سنگہ بیما خوآ، د دنیا گنی دا غا دوران دئی

مرشوا مامونئی پہ ہر چا کڑے ارمان دئی . . . . . .

۳۔ او وے مامونئی تا سو چا ژراتا سمبال کڑے

تا سو دے سود وئی ماغریبا پہ حلالا کڑے

دا غا ماشوم زوئے خورازدے زماں خو آلا کڑے

چہ اے او وینم پہ سترگو در تنگ ساعت لہ ہجران دئی

سنگا بیما خوآ، د دنیا گنی دا غا دوران دئی

مرشوا مامونئی پہ ہر چا کڑے ارمان دئی . . . . . .

۴۔ چہ اے ولی د و پسترگو مامونئی نارے سورے کڑے

لیتے ٹکاوی دخیال جامے اے ولو سرے کڑے

تو نوئے یے بیل تنا ڈیرو خنے دے سپیرے کڑے

سوک چہ کورکے دوا خاطے ساتی سختے گزران دئی

سنگا بیما خوآ، د دنیا گنی دا غا دوران دئی

مرشوا مامونئی پہ ہر چا کڑے ارمان دئی . . . . . .

۵۔ سوک چہ کورکے دوا خاطے ساتی حیاب اے تلی دی

یو دبل پہ سر جنگلے کوئی کچا لدلی دی

گورا اے مامونئی تا بے گناہ دے وزلی دی

گرڑے لگ جھپٹ پکے ترکاں فضل رحمان دی
سنگا نیما خو آ، د دنیا گئی دا غا دوران گئی
مڑشوا ماموننی پسے ہر چا کرڑے ارمان دی . . . .

چار بیتہ ہونے پر بھی اس کے گانے کا ڈھنگ پہلے گیت سے جدا محسوس ہوا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اسے فضل رحمان بڑھئی نے تیار کیا تھا، وہ ماوا گئی گاؤں میں رہتا تھا، جہاں ماموننی کے سسرال تھے۔

میں نے گیٹ کیپر کا شکریہ ادا کیا، اُسے جلدی تھی، وہ چلا گیا، اور میں اپنے دوست کی مدد سے گیت کا ترجمہ لکھنے لگا:

"یہی اس دنیا کی ریت ہے!
ماموننی مرگئی، ہر کوئی اس کے لئے ارمان کر رہا ہے
کیسی بے وفا ہے یہ! یہی اس دنیا کی ریت ہے!
۱۔ ماموننی مرگئی۔ سچ مچ وہ ایک حور تھی۔
حسن کے لحاظ سے وہ ایک پری تھی، اپنے وطن میں مشہور تھی
اصل میں وہ باجوڑ کی پراچگے نسل سے تھی، گھنوں سے لدی ہوئی
اُس کی سوت نے چغلی کھائی کہ ایک نوجوان اُس پر عاشق ہو گیا ہے
کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اس دنیا کی ریت ہے
ماموننی مرگئی، ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے . . . .

۲۔ سوت نے چغلی کھائی ۔ اپنے پرائے جمع ہو گئے
اُنھوں نے مامونئی کو گھیر لیا اور وہ اُس کی موت کے خواہشمند ہو گئے
رنگ اور حُسن دونوں مامونئی کے لئے غم کا باعث بن گئے
مامونئی بولی ۔ "میری موت کا سامان ہو گیا!"
کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اِس دُنیا کی ریت ہے ۔
مامونئی مر گئی، ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے

۳۔ مامونئی بولی ۔ تم لوگ میرے لئے چھُری تیز کر لو
تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے ۔ مجھ غریب کو حلال کر لو
میری معصوم بچّی کو میرے پاس لے آؤ
مَیں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ تو لوں، تھوڑی دیر بعد تو مجھے
اُس سے جُدا ہونا ہے ۔
کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اِس دُنیا کی ریت ہے!
مامونئی مر گئی ۔ ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

۴۔ جب مامونئی نے (بچّی کو) اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ اُس نے افسوس
کا نعرہ مارا ۔
اُس کی ٹانگیں پھڑ پھڑانے لگیں اور (عالم تصوّر میں) اس نے اپنے
خون سے لت پت کپڑے دیکھ لئے ۔

او جُدائی! کاش تُو نہ ہوتی۔ تُو نے بہت سے گھر برباد کیئے
جو بھی گھر میں دو بیویاں رکھتا ہے اُس کا وقت مُشکل سے کٹتا ہے
کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اِس دُنیا کی ریت ہے!
مائونی مرگئی۔ ہر کوئی اُس کے لیئے افسوس کر رہا ہے۔۔۔۔۔

۵۔ جو بھی گھر میں دو بیویاں رکھتا ہے، اُس کی عزت چلی جاتی ہے۔
ایک بیوی دوسری پر چغلی کھاتی ہے کسی نے یہ دیکھا ہو تو وُہ
اس سے ہونے والا نقصان سمجھ سکتا ہے۔
دیکھو مائونی بے گناہ ہی ماری گئی
فضل رحمان بڑھئی نے تو صرف اس کی تھوڑی سی صفت کی ہے
کیسی بے وفا ہے یہ، یہی اس دُنیا کی ریت ہے!
مائونی مرگئی۔ ہر کوئی اُس کے لئے ارمان کر رہا ہے۔۔۔؛

پرے مغرب میں سُورج ڈوب رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جب دِن دہاڑے مائونی مار ڈالی گئی تھی اس سُورج نے بھی یہ غمناک واقعہ ضرور دیکھا ہوگا۔
میرا دوست بولا" یہ دونوں گیت ہمارے وطنی گیتوں کے اچھے نمونے ہیں۔ اور گو ہمارے پُرانے رواج کے مطابق ہر چاربیتہ کے آخر میں اُس کے پہلے شاعر کا نام قائم رکھا جاتا ہے، اس کا درجہ عوام کے دوسرے گیتوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوسرے گیتوں کی طرح اِس کے

الفاظ میں بھی کانٹ چھانٹ اور اضافے کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔"

میں نے کہا "بجا ہے۔"

"ماموئی کو ہوئے بہت عرصہ نہیں گزرا ... یہ انگریزوں کے اِدھر آنے کے بعد کا واقعہ ہے ... بلکہ میں تو سمجھتا ہوں جنگِ یورپ کے دنوں کی بات ہوگی۔ ایسے گیت میں جہاں دیہاتی شاعر نے کہا ہے ــ "شیرِ عالم اِکدار تیرے جسم میں جرمنی کی توپ سوراخ کر دے" اسی بات کا اشارہ کرتا نظر آتا ہے۔"

"بجا ہے۔"

"ایک ماموئی پر ہی بس نہیں۔ اِدھر اکثر ایسی غمناک واردات ہو جایا کرتی ہیں۔"

"تو ایسے اور بھی گیت ملیں گے"

"کیوں نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہر ایک واقعہ گیت میں نہیں سما پاتا اور نہ ہر ایک گیت ایک سا کامیاب ہی ہو سکتا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ ماموئی کوئی عام عورت نہیں بلکہ عصمت کی دیوی ہوگی، تبھی اُس پر ہوئے ظلم سے تڑپ کر دو شاعروں نے ایک ساتھ گیت تیار کئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر پُرسوز، ایسے کہ دل کی گہرائیوں میں اُترتے چلے جائیں۔

ماموئی کے خاوند پر مجھے بہت غصہ آیا۔ یُوں قانون کو ہاتھ میں لینے

کا اُسے کیا حق تھا؟ کمبخت! ...... دیوانہ! ..... مرد کتنا اندھا ہو
سکتا ہے! اُس کی حماقت کتنا ظلم ڈھا سکتی ہے! ماموہنی سُندر عورت تھی،
اِس لئے اُس کی عصمت پر اتنا شک کیا گیا۔۔۔ "مرد کی حماقت بڑی!"
میں نے بلند آواز سے کہا۔

میرا دوست گٹھڑی بنا بیٹھا تھا۔ بولا "مرد کو بُرا نہ کہو۔۔۔ یہ گیت
بھی تو مرد نے بنائے ہیں، عورت نے نہیں۔۔۔۔ کتنا درد بھرا پڑا
ہے ایک ایک لفظ میں۔۔

۹

ابھی کو بنا سسرال نہ جائے گی

کو بتا میری بیٹی ہے۔ لوریاں سنتے اُسے چار سال ہو گئے۔ اب اس نے پانچویں سال میں قدم رکھا ہے[1]۔ دیکھتا ہوں لوریاں سُننے کا اُسے بے حد شوق ہے، اور اب تو وہ ان کی زبان بھی سمجھنے لگی ہے۔

ان میں اُسے ماں کا پیار ملتا ہے۔ کتنی کشش، کتنی شیرینی پاتی ہے وہ اس مادری محبّت کی سادہ شاعری میں، یہ کوئی اُسی سے پُوچھے۔ پر شاید وہ جواب نہ دے سکے۔ لوریاں سُنتے سُنتے جب وہ ایک خاص انداز سے مسکراتی ہے، تو مجھے ان کا صحیح لطف حاصل ہوتا ہے۔ مسکراہٹ پر تو

[1] یہ مضمون ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا تھا۔

بچوں کا حق ہونا ہی چاہیے اور لوریوں پر بھی۔

ابھی اگلے ہی دن وہ ضد کرنے لگی تو اُس کی ماں بول اُٹھی "کوئی کیسے منائے، اس ذرا ذرا سی بات پر رُوٹھنے والی لڑکی کو!"

میں نے پاس سے جھٹ کہہ دیا "کوئی لوری گا دو۔ اسے خوش کرنا بھی کچھ مشکل ہے؟"

ماں کا دِل بھی عجیب چیز ہے۔ یہ دھرتی پر کیسے آگیا؟ سوچتا ہوں اس کی تخلیق سُورگ میں ہوئی ہوگی۔ پھر اُس خالق نے سوچا ہوگا — چلو اسے دھرتی پر بھیج دیں تاکہ اس کے لمس سے وہاں بھی ایک سُورگ بس جائے۔

میرے ذرا سے اشارے پر ماں کا غصہ دُور ہو گیا، ممتا بھری لوری اُمڈ آئی:

"کوِیتا آوے ہیں گُگن جاناں:
کوِیتا دے پیریں کڑیاں،
مَیں واج پچھاناں!"

— کوِیتا آتی ہے۔ پر میں نے کیسے جان لیا؟ کوِیتا کے پاؤں میں "کڑیاں"[1] ہیں، میں جھنکار پہچانتی ہُوں!

پنجابی لوریوں کی ایک دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ انہیں گاتے ہوئے ہر ماں اِن کے مصرعوں میں اپنے بچّے یا بچّی کا نام شامل کر سکتی ہے۔ نہ جانے

[1] زیور کا نام۔

یہ لوریاں کتنی پرانی ہیں۔ ان کے ساتھ گوریا کا نام شامل ہو جاتا ہے تو محسوس کرتا ہوں کہ اسی کے لیے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ انہیں سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔

"گوریا آئی کھیڈ کے، پینیدی آئی دھم
روٹی دیاں چوپڑ کے، چُنی لیندی چُم!"

— گوریا کھیل کر آئی ہے۔ اس کے آگے، دھوم دھام ہوتی آئی۔ گھی سے چپڑی ہوئی روٹی دیتی ہوں اُسے۔ اس کی چُنری کو چوم لیتی ہوں۔

"سن نی گوریا لوری
تینوں دیاں گنے دی پوری!"

— سن، گوریا! یہ میری لوری، گنے کی پوری دیئے دیتی ہوں تجھے۔

"گوریا دی ماسی آئی اے
دُدھ ملائی لیائی اے"

— گوریا کی خالہ آئی ہے، دودھ اور ملائی لائی ہے وہ۔

گوریا مٹھائی کے لیے ضد کر رہی تھی، لوریوں میں الجھ کر وہ مٹھائی کو بھول بیٹھی۔ اب اس نے لوریوں کے لیے ضد شروع کر دی۔ پر ضد کرنے میں اس کی ماں بھی تو کم نہیں۔ بولی "کہاں سے گا کے جاؤں اس کے لیے نت نئی لوریاں؟ بھلا میں کیسے بن جاؤں لوریوں کی مشین؟"

میں نے کہا "لوری گانے میں کونسی طاقت خرچ ہوتی ہے ؟"

جب بھی لوریوں کی بات چلتی ہے میں ہمیشہ کویتا کی حمایت کیا کرتا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے خود ان سے ایک گونہ لگاؤ ہو گیا ہے، ان کے میٹھے بول سنتا ہوں تو بچپن کے سپنوں میں کھو جاتا ہوں۔ کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کہ میرا اپنا بچپن کویتا کا روپ دھار کر لوریاں سننے لوٹ آیا ہے بالزاک کا وہ خیال کہ دنیا کا سب سے میٹھا گیت وہ لوری ہے جسے ہم صبح زندگی میں ماں کے منہ سے سنتے ہیں، مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

ادھر کویتا اپنی ضد میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی ماں کا مسکراتا ہوا چہرہ کویتا کی فتح کا ترجمان تھا۔ میں نے کہا "کوئی اچھی سی لوری گانا۔"

"لوریاں ساری اچھی" کویتا بول اٹھی "کبھی بری نہیں۔"

اس کی ماں گانے لگی :

"اُڈّ نی چِڑیئے ! اُڈّ وے کاواں !!

کویتا کھیڈے نال بھراواں !"

— "اُڑ جا ری چڑیا! اُڑ جا رے کوّے، کویتا اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیل رہی ہے !"

کویتا نے جھٹ پوچھا "میرے بھائی کہاں ہیں اماں ؟"

"گلی محلے کے لڑکے جو تیرے ساتھ کھیلنے آتے ہیں سب تیرے بھائی ہیں۔"

"اور لڑکیاں میری بہنیں ہیں؟"

"ہاں، ہاں"

پھر اُس کی ماں گانے لگی:

"کویتا بی بی رانی

سوہریاں دے گھر جانی"

—کویتا بی بی رانی ہے، وہ سسرال میں جانے والی ہے۔

مَیں نے کہا "یہ لوری نہ گایا کرو۔ ابھی کویتا سسرال نہیں جائے گی"۔

بیٹی کی شادی سے سبکدوش ہوکر ماں باپ کو ہمیشہ خوشی ہوتی ہے، مگر مجھے اُس وقت بیاہی جانے والی لڑکی کے جذبات کا دھیان آگیا تھا۔ پہلے گھر کو الوداع کہتے ہوئے لڑکی کے دِل میں اِک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ مرد اکثر اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ پنجاب کے ایک دیہاتی گیت میں کسی لڑکی نے کہا ہے "مُنڈے آپنے تھائیں رہندے، نی دِھیاں کیوں بنائیاں ربّ نے؟"— یعنی لڑکے اپنے گھروں میں رہ سکتے ہیں۔ ہائے! خُدا نے بیٹیوں کو کیوں پیدا کیا؟

مجھے تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا پڑا۔ واپس آیا تو کویتا بدستور لوریاں سُنے جا رہی تھی۔ مَیں نے کہا، "شاباش، بچّی! ایسے ہی کیا کرو۔ یہ لوریاں تو بنی ہی تیرے لئے ہیں!"

کویتا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ لوری جاری رہی :

"کویتا دے وال، گڑ ونڈ رکھائے
مکھناں دے پالے جھل متھے نوں آئے"

— "کویتا کے بال بڑھانا شروع کرتے وقت ہم نے گڑ بانٹا تھا مکھن سے پالے ہوئے بال جھول کر اب ماتھے پر آپڑے ہیں۔"

مَیں سوچنے لگا کہ کون جانے پہلے پہل کس ماں نے اپنی بچّی کے بال بڑھانا شروع کرتے وقت اِس خوشی میں گلی کے بچّوں میں گُڑ بانٹنے کا رواج ڈالا ہوگا۔

پھر مَیں نے کہا "دیکھوجی! یہ نیا زمانہ ہے، گُڑ کے دن کبھی کے بیت گئے۔"

"مطلب ؟"

"مطلب یہی کہ اِس لوری سے 'گُڑ' کا لفظ نکال دو۔ اس کی بجائے 'کھنڈ' (کھانڈ) کہنا ہوگا۔ ۔ ۔ اور تم دیکھو گی کہ 'کھنڈ' اور 'ونڈ' کی ہم آہنگی لوری کے الفاظ میں ایک نیا ہی رس بھر دے گی۔"

کویتا بول اُٹھی "کھانڈ اچھی ہے، گُڑ بھی اچھا ہے۔ صبح مَیں نے گُڑ کھایا تھا۔"

بس اتنی سی بات سے کویتا نے اپنی ماں کی طرف داری کر دی، جس نے شاید مجھے چھیڑنے کی خاطر نئی لوری شروع کی :

"کویتا آوے ہٹیوں
گُڑ کڈھاں کوری مٹیوں!"

— "کویتا دکان سے آرہی ہے، اس کے لئے میں کورے مٹکے سے گڑ نکال رہی ہوں۔"

کویتا نے لوریوں کی مانگ ختم کر دی تھی۔ سوچا اسے ایک لوری اور سنوا دوں۔ اس کی ماں میری رمز پہچان گئی۔ بولی "شوق سے سکھا دیجئے اس ابیلی چھوکری کو، کہ وہ ضد پر قائم رہے۔"

"ورنہ نہیں تو وہ 'کوکو' والی لوری تو بری نہ رہے گی۔"

"آپ سنا دیں"

"اچھا میں سنا دیتا ہوں" یہ کہتے ہوئے میں نے لوری شروع کی:

"چیچی چیچی کوکو کھائے
دودھ ملائیاں کویتا کھائے!"

— "آنکھوں کی چیچیڑ 'کوکو' کھائے گی اور دودھ ملائی کھائے گی کویتا!"

یہ "کوکو" نہ جانے کیا بلا ہے۔ روتے بچے کو چپ کرانے کے لئے اکثر کہا جاتا ہے، "چپ کو کو آجائے گی!" بچے ڈر کر چپ ہو جاتے ہیں اور "کوکو" کو آنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کسی نے اس فرضی ہستی کو دیکھا نہیں۔

"اچھی لوری ہے!"

"ہاں، کیوں نہیں؟"

لاکھ کوئی انہیں بے معنی کہے، جو جگہ لوریوں کو مل چکی ہے وہ اب ان سے

کوئی چھین نہیں سکتا۔ میرا تو خیال ہے کہ ان کے سُر بچے کے دل میں راگ کا احساس بیدار کر دیتے ہیں اور جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مائیں اکثر اُسی وقت تک لوریاں گاتی ہیں جب تک بچہ جھُولے کا پابند رہتا ہے تو مجھے اُن کی عقل پر حیرت ہوتی ہے۔ جب بچہ ذرا ان کا مطلب سمجھنے لگے اُس وقت تو لوریوں کو دُگنے شوق سے گانا چاہئیے۔ مانا کہ زندگی کے ساحل کو لوریاں سمندر کی لہروں کی طرح چُومتی ہیں اور ان کے بعد آنے والے گیتوں کے ریلے پہلے سب نشانات مٹا ڈالتے ہیں، پر مجھے یقین ہے کہ اگر ماں اپنے بڑے بچے کے لئے بھی لوریاں جاری رکھے تو یہ اُس کے دل پر بعض دیرپا نشانات چھوڑ سکتی ہیں۔

کویتا کی ماں بولی "اب میری آواز بنسری کی طرح صاف تو ہے نہیں۔۔۔۔"

مَیں نے بات کاٹ کر کہا "اور میری ہی آواز پر کب بنسری کا دھوکا ہوتا ہے!"

مَیں جانتا تھا کہ مَیں نے اُسے ایک آدھ اور لوری گانے کے لئے اکسا دیا ہے۔ بولی "اچھا تو سُنو!"

"کویتا دے سوہرے بیڑے بناواں
جی اودر جاوے جھبّے مِل آواں!"

کویتا کے سُسرال مَیں کہیں نزدیک طے کروں گی۔ جی اُداس ہونے پہ جھٹ اُسے مِل آیا کروں گی!"

مَیں نے کہا "جس بات سے مَیں تمہیں منع کرتا ہوں، وہی تمہیں پسند ہے۔۔۔۔ ابھی کویتا سُسرال نہیں جائے گی۔"

۱۰

اپنی جورُو کو سمجھا

"شاباش، بیٹا! اللہ تیری عمر دراز کرے ... جلدی قدم اُٹھا سیانے دُولھا! ..."

اُس وقت مجھے کسانوں کے وُہ الفاظ یاد آرہے تھے جو وہ پیار سے بیل کو پچکارتے وقت مُنہ سے نکالتے ہیں۔ اپنے گاؤں میں مَیں نے انہیں بہت سُن رکھا تھا اور اس وقت وہ اپنی ساری حرکت اور تاثیر کے ساتھ میرے ذہن میں بیدار ہو گئے تھے۔

ہم بہت دُور نکل آئے تھے۔ کھیتوں میں ہل چل رہے تھے۔ ایک بوڑھا کسان اپنے بیلوں کو پُچکار رہا تھا۔ راستے میں مَیں نے تصویر کا دُوسرا رُخ بھی

دیکھ لیا تھا، ایک بیل بُری طرح پٹ رہا تھا۔

دوارکا ناتھ کو متوجہ کرتے ہوئے میں نے کہا "بیلوں کو یُوں پُچکارنا بھی اُن سے کام نکالنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اگر بیل کے قدم آگے نہ اُٹھیں، یا وہ ذرا سُست نظر آئے، تو یہی کسان، جو اب یُوں پیار ظاہر کر رہا ہے کہ اُس کا سارا پیار اُسی کے لئے ہے، بے رحمی پر اُتر آئے، اور شاید یہ بھی نہ دیکھے کہ کم مارنے سے گزارہ ہوسکتا ہے تو پھر زیادہ لال پیلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

دوارکا ناتھ بولا "کسان خود بھی اِن بیلوں سے اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ فرق اتنا ہی ہے کہ یہ بیل نہ روتے ہیں، نہ ہنستے ہیں اور نہ زیادہ بڑبڑاتے ہیں، بس خاموشی سے مار کھاتے رہتے ہیں اور خود کسان بہت چلاتے ہیں۔ مگر زمیندار کا جُوا اُن کے گلے میں شاید ہمیشہ کے لئے پڑ گیا ہے۔ اب زمیندار کو تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بدلے میں اپنے نیچے کام کرنے والے غریب بیلوں پر اپنا غصّہ نکالتے رہتے ہیں۔"

اُس کا پُورا نام تھا مدّی کیرے دوارکا ناتھ بی۔اے۔ مگر میرے لئے وہ صرف دوارکا ناتھ تھا۔ اُس کی مدد سے میں نے اُس کی زبان کے بہت سے گیتوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اکثر وہ اِس بات پر زور دیا کرتا تھا کہ کرناٹک کے دیہاتی گیت بے حد سادہ ہیں، اِسی لئے وُہ تاثیر میں ڈُوبے ہوئے ہوتے ہیں

اور یہی عمدہ گیتوں کی شناخت ہے۔

میں نے اُسے بتایا کہ ایک بوڑھا بیل ایک پنجابی گیت میں اپنے مالک سے یہ شکایت کرتا ہے کہ بڑھاپے میں اُسے منڈی میں لے جا کر بیچ آنے کا خیال سرے سے بے رحمی پر مبنی ہے۔ منڈی میں اُسے کوئی بُوچڑ ہی خرید سکتا ہے۔ اس سے بہتر تو یہ ہو کہ وہ اُسے گھر پر ہی رکھے اور سبز گھاس کی بجائے چند سُوکھے تنکے ہی کھِلا دیا کرے۔

وُہ بولا" ہو سکتا ہے، بوڑھے بیل کا ایسا کوئی گیت ہمارے علاقے میں بھی مِل جائے۔ مگر بَیل کا ایک دُوسرا گیت مجھے یاد ہے وہ "بِتّیی ناہاڑو" کہلاتا ہے۔ بِتّیی ہم بَیل کو کہتے ہیں اور ہاڑو گیت کا ہم معنی ہے۔ "بِتّیی ناہاڑو" یعنی بَیل کا گیت۔ مگر مضمون کے لحاظ سے مَیں اِسے "بَیل کی شکایت" کہنا مناسب سمجھتا ہوں"۔

"کِس کی شکایت کی ہے بَیل نے؟"

"اپنی مالکن کی"۔

"پوری بحث تو وہ گیت سُننے کے بعد ہی کی جا سکتی ہے۔ مگر اتنا ظاہر ہے کہ ہمارے دیہاتی گیتوں میں صدیوں سے ہل میں جُتنے والے خاموش بَیل بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں"۔

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ خُود خاموش رہ کر بیلوں نے اپنی زبان کسانوں کو

دے دی ہے"۔

"سچ کہا۔۔۔ بات یہ ہے کہ ہمارے کسانوں کی زندگی، جیسا کہ میکسم گورکی نے پرانے روس کے متعلق لکھا ہے، "ایسی غریبی اور جہالت میں گزرتی ہے کہ غم اُن کی تفریح کا ایک بہانہ بن جاتا ہے۔ دُکھ اور ہیتا سے وہ بچّوں کی طرح کھیلتے ہیں اور اپنی تکلیف پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ کام سے تھک جاتے ہیں تو بدنصیبی کے تکیئے پر آرام کرتے ہیں۔ آگ ہے اُن کے لئے کھلونا اور زخم ہے اُن کے جسم کا زیور!"۔۔۔ اور اپنے غم کے علاوہ کسان اپنے مویشیوں کے غم کو بھی اپنی تفریح کا کچھ کم بہانہ نہیں سمجھتے۔ جس طرح خاموش بیل نے اپنی زبان اپنے مالک کو سونپ دی ہے، اُسی طرح پرانے زمانے میں کتنے ہی دُوسرے جانداروں اور پیڑ پودوں تک نے اپنے بھید بھرے جذبات اُن رشیوں کو سونپ دیئے تھے جو جنگلوں میں آشرم بنا کر رہتے تھے۔ قدیم ہندوستان کی شاعری اس کی امانت دار ہے"۔

سامنے ایک کسان اپنے بیل کو پُچکار رہا تھا۔ میں نے پُوچھا "یہ کسان کیا کہہ رہا ہے؟"

"چل ری جلدی چل، میرے نندی!" وہ کہہ رہا ہے" جیسے خُود وہ کوئی شِو ہو"۔

ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ پرے ایک مندر نظر آ رہا تھا۔ شاید

یہ شیو کا مندر تھا۔ مندر کا شیو کیا جانتا تھا کہ کھیتوں میں ہل چلاتے وقت اپنے بَیل کو پچکارتے ہوئے دھرتی کا بیٹا بھی دیوتا بن جاتا ہے، اور پھر جب وہ ایک لمبے یا چھوٹے وقفے کے بعد اُسی زبان سے گالیاں دینے لگتا ہے تو اپنے بڑے سے بڑے دیوتا سے بھی نہیں ڈرتا۔

دوارکا ناتھ اپنا گیت سُنانے لگا:

"ماگی آ ہوڑی آگا
نا کنی لے مائے وِندا ماڑسی کونڈیا
نا ہوگی اوندا
تینی دھنتا رتن درا
کُل کُلی لے ہوڑا دیو
نم جیوا ہو داود کنی لاس کا!"

۔۔۔ ماگھ مہینے کا ہل چلاتے وقت
مجھ سے محبت کے ساتھ سب کام کرا لیا
مَیں نے جا کر اناج کی ایک بال کھا لی
تم نے مجھے پتھروں سے مارا
میری رُوح کیلاش (پربت) کو چلی گئی!"

مَیں نے حیران ہو کر کہا، "تو بَیل مر گیا!"

"نہیں تو۔ اِس بند کی آخری سطر میں بَیل کہتا ہے کہ اُس کی روح کِسان کے پتھر دے مارنے سے تڑپ اُٹھی اور کیلاش پربت کو چلی گئی تاکہ شِو سے شکایت کرے۔ شِو پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بیلوں پر ہونے والے ظلم کا انسداد کیا کرے، ورنہ اُسے نندی بیل پر سواری کرنے کا کیا حق ہے؟"

مگر میرے ذہن میں میرا اپنا خیال گونج رہا تھا — تو بیل مر گیا!

گیت کی آواز سُن کر چند کِسان اپنے ہل چھوڑ کر ہمارے قریب آ گئے۔ اُن میں سے ایک، جو بہت بوڑھا تھا، میرے چہرے کی طرف پُرغور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں محسوس ہُوا کہ میرے اپنے مرحوم دادا میرے سامنے آ بیٹھے ہیں۔

دوار کا ناتھ نے دوسرا بند شروع کیا:

"نا وونداربتی دا
نا اوندا بیلا دِیدا
نا ہوگی اوندا
ہوڑے دھنٹا تن درا
بڑبڑا گِلے ہوڑا دِیو
نم جیوا ہو دارو کئی لاس کا!"

— "مَیں نے ہی یہ کھیت بویا

مَیں نے ہی اِس میں اناج اُگایا
مَیں نے جا کر ایک
بے دانوں کی بال کھا لی
تُم نے مجھ پر لگاتار ڈنڈے برسائے
میری روح کیلاش پربت کو چلی گئی!'

مَیں نے کہا: "بیل کی پُکار کتنی غمناک ہے۔ صدیوں سے یہ پُکار اِسی طرح بلند ہو رہی ہے۔ اب تک یہ آواز شاید نندی بَیل کے کانوں تک نہیں پہنچی، ورنہ کیا وہ اپنے اوپر سواری کرنے والے دیوتا سے کہہ کر اپنی برادری والوں کا دُکھ درد ہمیشہ کے لئے مِٹا نہ ڈالتا۔"

دوارکاناتھ نے میری طنز بھانپ لی اور مُسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وُہ بوڑھا کِسان اُیسی چبھتی ہوئی نگاہ سے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا، جیسے اُس نے میری بات سمجھ لی ہو اور کہہ رہا ہو کہ شو اور نندی کے متعلق یوں خیال کرنا پاپ کرنے کے برابر ہے۔

دوارکاناتھ نے تیسرا بند شروع کیا:

"ہتی کلا کرُدُو اندرا
ننا مرڈی اتّا ماری ترُو ویالا
نہّا گو لاگا تتّندرا

کھنڈ گا تنُّودا

تُنڈی ناتن دُھوڑو

نم جیوا ہوداود کئی لاس کا !"

—' تم مجھے بنولے کھلانے کو کہتے ہو

تمہاری جورُو (یہ سُن کر) دُوسری طرف مُنہ پھیر لیتی ہے۔

تم اُس سے دس "گولا گا" بھر اناج کھانے کو کہتے ہو۔

وہ ایک "کھنڈ گا" کھا ڈالتی ہے

اِس اُلھڑ البیلی کو تم نے کیوں ڈال رکھا ہے گھر میں ؟

میری رُوح کیلاش پربت کو چلی گئی ! '

دوارکا ناتھ نے بتلایا کہ "گولا گا" ایک طرح کا پیمانہ ہوتا ہے اور "کھنڈ گا" کا ناپ بیس "گولا گا" کے برابر ہوتا ہے۔

مَیں نے کہا " اِس بند بین بَیل کی آواز ایک قدرتی صاف گوئی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ جب رنج انتہا کو پہنچتا ہے تو اکثر آدمی پاگل ہو جاتا ہے مگر بَیل کی صُورت میں ایسا نہیں ہُوا۔ یہاں پہنچ کر وہ بھُول گیا کہ خود کسان نے اُسے اناج کی ایک بال کی خاطر پتھروں اور ڈنڈوں سے مارا تھا۔ اپنے خاوند سے یہ سُن کر کہ بَیل کو بنولے کھلانے چاہئیں، کسان کی بیوی نے مُنہ پھیر لیا، بس یہ بے توجہی اُسے ایک آنکھ نہ بھائی۔ اور بَیل نے بھی

چاہتا ہے کہ اُس کے مالک کے گھر کا خرچ کفایت سے چلے۔"
دوارکاناتھ اگلا بند گا رہا تھا:

"ہنڈی آکڑو اندرا
رتنا مڑ دی مُو گئے مُرادالا
کھنڈ گا تِنن ررا
اِکھنڈ گا تِنتھا
تِنڈی ناتِن ڈھوڑو
نم جیا ہودا وو کنی لاس کا!"

—"تم مجھے کھلی کھلانے کو کہتے ہو
تمہاری جورو یہ سُن کر ناک سکوڑ لیتی ہے۔
تم اُس سے ایک "کھنڈ گا" بھر اناج کھانے کو کہتے ہو
وہ دو "کھنڈ گا" بھر اناج کھا ڈالتی ہے
اِس الھڑ البیلی کو تم نے کیوں ڈال رکھا ہے گھر میں؟
میری رُوح کیلاش پربت کو چلی گئی!"

سب کسان قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ دوارکاناتھ جھینپ کر بولا ۔" یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ اِن کو اتنی سمجھ ہی نہیں کہ گیت کے اندرونی سوز کو پہچان سکیں۔ مجھے خوب یاد ہے جب مَیں نے پہلے پہل ایک گاؤں میں اِسے سُنا

تھا تو میری آنکھیں نمناک ہوگئی تھیں۔"

اتنی خیر تھی کہ اس نے یہ باتیں کنڑی زبان میں نہیں کہی تھیں۔ کسان ہماری طرف غور سے دیکھ رہے تھے، اور وہ بوڑھا کسان تو یوں تک رہا تھا جیسے میرے آر پار دیکھ لے گا۔

دوارکا ناتھ گا رہا تھا:

"اِگّی درا ہینڈی نادِنا
ہچّی درا اُگّل نادِنا
دیورا مُندی نا
پرساد نا آدا
متّیاتا کا دینا؟
نم جیوا ہودا و وکنی لاس کا!"

ــُ (رفع حاجت) کرتا ہوں تو گوبر مہیّا ہوتا ہے
گوبر تھاپنے سے اُپلے بنتے ہیں
دیوتا کے سامنے کا
پرساد (بھی یوں) میری مدد سے مہیّا ہوتا ہے۔
پھر اور کس کس کام آؤں؟
میری رُوح کیلاش پربت کو چلی گئی!'

دوارکاناتھ نے بتلایا کہ چوتھی سطر میں جس پرساد کا ذکر آیا ہے وہ بھسم یا بھبوت ہے جو آخر اپلوں سے بنتی ہے اور مندروں میں اکثر بھگتوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔
پھر وہ آخری بند گانے لگا:

"ست راگنگ لادہنا
ہیٹی درا کیرادا دینا
ہیگلا میا لا ڈنتا
بار کو لا نا ہوا
متیا تا کا دینا؛
نم جیوا ہو دادو کئی لاس کا!"

— مر جاتا ہوں تو کھال مہیا کرتا ہوں
پہننے کو (اِسی سے) جوتے بنتے ہیں
(ہم بیلوں کے) کندھوں پر لہرانے والا چابک (بھی)
(اِس کھال سے) مَیں ہی مہیا کرتا ہوں
پھر اور کس کس کام آؤں؛
میری رُوح کیلاش پربت کو چلی گئی!'

گیت ختم ہو گیا۔ مگر کسان ہلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ دوارکاناتھ سے پتہ چلا کہ یہ گیت "ملی گے ڈنڈے" (چنبیلی کا گچھا) نامی دیہاتی گیتوں کے مجموعے

میں، جو کہ دھارواڑ سے "کا پسے ریو یا نوڑرو" نے مرتّب کر کے شایع کیا ہے، موجود ہے۔ پھر کافی وقفے کے بعد وہ بولا ۔ "بے زبان جاندار پر آدمی کتنا ظلم کرتا ہے!"

اپنا یہ خیال اُس نے کنڑی زبان میں کسانوں کے سامنے بھی پیش کر دیا۔ باقی سب تو خاموش رہے، مگر وہ بوڑھا بڑبڑانے لگا۔ پتہ چلا کہ وہ دوارکا ناتھ کی رائے سے متفق نہیں ہے "کسان بُرا سہی اور اُس کی جورو بھی بُری سہی، مگر یہ گیت کسی بیل نے تھوڑا ہی بنایا ہے؟ .... اور خود کسانوں پر کیا کم ظُلم ہوتا ہے۔ بیل کا تو صرف بہانہ ہے۔ سچ پوچھو تو یہ گیت ہم نے اپنے متعلق بنایا ہے ...." کچھ اِس طرح کا خیال اُس بوڑھے کسان نے ظاہر کیا۔

پھر کسان عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے کھانا لئے آنکلیں۔ بوڑھے کسان نے مُٹھی بھر بھات پاس آ بیٹھے بیل کے مُنہ میں ڈالا، تو اُس کی جورو لال پیلی ہو کر بولی "بڑا آیا ہے دیا کرنے والا۔ پہلے اپنی بھوک تو مٹا لے"۔

11

وہ کسان شہزادی

ایک شہزادی تھی بڑی خوبصورت۔ سات سمندر پار ایک جزیرہ تھا دور، بہت دور۔ وہاں ایک مدت سے شہزادی اپنے پلنگ پر پڑی سو رہی تھی۔ اُسی شہزادی کی تلاش میں ہماری کہانی کا شہزادہ سرگرداں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اُسے اپنی دُلہن بنا سکے گا۔ پھر جب وہ مسکرایا کرے گی، اُس کے مُنہ سے پھول جھڑا کریں گے۔

شہزادہ اتنی دُور کیوں جا رہا تھا؟ اُس کی اپنی سلطنت میں کیا ایسی ایک بھی لڑکی نہ تھی جو اُس کے سپنوں کی رانی بن سکتی؟ آج وہ شہزادہ

کہاں ہے؛ وہ اپنی سلطنت میں لوٹ آیا ہے یا سمندروں کے سینوں پر بھٹکتا پھرتا ہے؛ آج وہ ہمارے گاؤں میں آ جائے اور چھلّو کا سرسوں کے پھول کو شرمانے والا مکھڑا دیکھے، اس کے گیت سنے، تو وہ کہہ اٹھے: "اے کسان شہزادی، دھرتی کی بیٹی! میں تجھے پیار کرتا ہوں، آج سے سات سمندر پار کی اس نامعلوم شہزادی کو کبھی یاد نہ کروں گا۔"

نام ہے کوشلیا، مگر پیار سے ماں اسے چھلّو کہہ کر بلاتی ہے۔ اس کی سہیلیاں بھی اسی نام سے بلاتی ہیں اور میں بھی۔ بسنت پنچمی کے دن میں اس کے گھر گیا تھا تو اس نے مجھے پانچ چھ گیت سنائے۔ اس کا چاند سا مکھڑا کتنا معصوم نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا تھا "چھلّو اب سیانی ہو رہی ہے۔"

"او دوں کیوں نہ آیا متّرا

جد رنگ سی سرھوں دے پھُل ورگا؟"

— تب کیوں نہ آیا، او دوست! جب میرا رنگ سرسوں کے پھول سا تھا۔

چھلّو گا رہی ہے۔ کیا وہ ہماری کہانی کے شہزادے کو تو مخاطب نہیں کر رہی! مجھے وہی گیت پسند آتے ہیں جن کی جڑ دھرتی میں گہری چلی گئی ہو، جن سے گاؤں کی دلی کیفیت کا پتہ چل سکتا ہو۔ سیپی کے سینہ میں جیسے موتی پروان چڑھتا ہے، گاؤں کے سینہ میں گیت پلتے ہیں۔ گاؤں کی دلہن اور بیٹی، جن پر خود موسیقی و شاعری کی دیویاں خوشی خوشی اپنے جوہر لٹا دیتی ہیں،

اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں پیار کا اتھاہ ساگر چھپائے، آج کے ترقی پسند ادیب کا تعارف وطنیت کی زوردار لہر سے کراتی نظر آتی ہیں۔

ٹیگور نے کہیں لکھا ہے۔ "ہم کھڑکھڑاتے پتّے ہیں، ہماری سرسراہٹ طوفان کا جواب ہے، مگر تم چُپ چاپ کون ہو؟" "مَیں صرف ایک پھُول ہوں!" چھلّو بھی ضرور ایک پھُول ہے۔ اپنی ماں کے گھر میں، اور خاص کر تنجن نام کی اُس محفل میں، جہاں گاؤں کی لڑکیاں باہم مِل کر چرخہ کاتنے بیٹھتی ہیں۔ ہاں، وُہ چُپ چاپ نہیں رہتی۔ وہ گایا کرتی ہے، شرماتے شرماتے۔ ایک دن اُس کی شادی ہوگی، اور اُس کی ماں اُسے پکار کر کہے گی:

"مُنڈا ویکھ لے سرہوں دے پھُل ورگا،
اگّے تیرے بھاگ لچھیئے!"

— سرسوں کے پھُول سا دُولھا دیکھ لے، پھر آگے وہی ہوگا او لچھّی! جو تیری قسمت میں بدا ہے!

یہ لچھّی کون تھی؟ اس سے ہمیں زیادہ سروکار نہیں۔ لچھّی اور چھلّو میں مَیں زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ آج چھلّو یہ گیت خود گا رہی ہے، اُس کی سہیلیاں سُر میں سُر مِلا کر اُس کا ساتھ دے رہی ہیں۔ مگر سوال تو صرف اتنا ہی ہے کہ کیا چھلّو کی ماں اُس کے لئے سرسوں کے پھُول سا دُولھا ڈھونڈ بھی سکے گی یا نہیں!

پیدائش، شادی، موت۔ کیا یہاں تک ہی زندگی کی دوڑ ہے؟ جو ہو، ابھی تو چھلّو پہ جوانی دیوانی چھا رہی ہے۔ اپنی ماں کے گھر میں وہ آرام کے دن گزار رہی ہے۔ خوشی اور تعجب کے ملے جُلے تأثرات سے پیدا ہونے والے گیت ہمیشہ اُس کے ہونٹ چوما کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ دِل ہی دِل میں اپنے آپ کو کوسنے لگتی ہے۔ دھڑکتے دل سے وہ گیت کے الفاظ دُہراتی ہے... ''سرسوں کے پھول سا دولہا دیکھ لے''... ''پھر آگے وہی ہوگا اور کچھ! ... جو تیری قسمت میں بدا ہے!''... مستقبل کا خیال اُس کے دِل میں عجب پریشانی پیدا کر دیتا ہے۔ ٹھیک ہے، دولہا بڑا خوبصورت ہی ہو تو اُس سے کیا بنتا ہے؟ نہ وہ اُس کے مزاج سے واقف ہوگی، نہ اُس کے سلوک سے۔ ماں باپ کو چھوڑنا پڑے گا، ساس نند کے بس میں رہنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر دولہا دُلھن کے معیار پر پورا نہ اُترے تو عُمر بھر کا رونا!

''جو بندھ گیا سو موتی!'' سماج کہتا ہے۔ شادی ضروری ہے۔ لڑکی کو والدین کا گھر چھوڑ کر سسرال میں جا کر رہنا ہی ہوگا۔

مگر چھلّو گا رہی ہے:

''منڈے آپنے تھاں نیں رہندے،
نی دھیاں کیوں بنائیاں ربّ نے؟''

ــــــ' لڑکے اپنی اپنی جگہ رہ سکتے ہیں۔ ہائے ری! خُدا نے لڑکیاں کیوں پیدا کیں؟'

سینہ بہ سینہ چلا آنے والا یہ دیہاتی گیت چھلّو کی سوانحعمری کا ورق بن گیا ہے۔

وہ چرخہ کات رہی ہے' اور سوچ رہی ہے کہ ایک دن اُسے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ دینا ہوگا:

"نکّے چھڈّوں گی کنک دے تیرے
رکھ لے کوآری بابلا!"

ــــــ' میں تمہارے گیہوں کے کھیتوں کو سیراب کیا کروں گی، اتا جان! مجھے کنواری ہی رہنے دو!'

پہلے چھلّو گاتی ہے۔ پھر اُس کی سہیلیاں اُس کے ساتھ مل کر گاتی ہیں۔ کبھی کبھی نئے گیت کا جنم ہو جاتا ہے۔

چھلّو کے گیت چھلّو تک محدود نہیں۔ ہاں، گیتوں کے انتخاب میں اُس کا رُجحان ضرور نظر آجاتا ہے۔

پنجابی شعر و نغمہ کی زبان ہے۔ صدیوں سے پنجابی گیت زندہ ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب تک پنجاب کے میدانوں میں دریا بہتے ہیں، اِس کے کھیتوں میں گیہوں اور باقی اناج پیدا ہوتے ہیں، اور جب تک تنجن

میں عورتیں باہم مل کر چرخہ کاتتی ہیں۔ یہ گیت مر نہیں سکتے۔ خاص کر وہ گیت جنہیں سُن کر بچپن کے سپنے جاگ اُٹھیں، جن کی طراوت دھرتی کی ہریاول اور دریاؤں کی روانی سے مل کر بنی ہے۔

ہمارے گاؤں میں گیتوں کا کال نہ ہُوا ہے نہ ہوگا چھلتو کے مزے دار گیت چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں ایک نئی رونق نئی رنگینی پیدا کر دیتے ہیں۔ خدا کی عام خلقت کے بنیادی ترنم اپنی آپ بیتی سُنا کر ہمیں زندگی اور موت کے دوراہے پر لا پہنچاتے ہیں۔ دیہاتی گیتوں کا خمیر اکثر چرخہ کی "گھوں گھوں" سے مل کر بنا ہے:

"چرخے دی گوُنج سُن کے
جوگی اُتر پہاڑوں آیا!"

— چرخے کی گونج سُن کر جوگی پہاڑ سے نیچے اُتر آیا!

گیت کی مختصر سی زمین میں نہایت کفایت سے کام لیا گیا ہے۔ عورت کی شاعری کی یہ مُنہ بولتی تصویر فنی لحاظ سے ایک کامیاب چیز ہے۔ کون جانے یہ گیت پہلے کس کی زبان سے نکل پڑا تھا؟ چھلتو اسے گاتی ہے تو اس میں اپنے دل کی آواز ملا دیتی ہے۔ عورت کا یہ گیت ہر ایک دوشیزہ کے غرورِ حسن میں ایک نئی چمک پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ وہ حسینہ ہے اور چرخہ کی گونج کے ذریعے اپنے حسن کی خبر پہاڑ کے جوگی تک بھیج سکتی ہے۔

کون جانے یہ جوگی کس پہاڑ پر رہتا تھا؟ چرخہ کی گونج اس کے کان میں پہنچی تو اس نے سمجھا کہ کاتنے والی ضرور کوئی حسینہ ہے۔ اسی جذبہ کے زیرِ اثر وہ نیچے اتر آیا اور اپنے خیال کا سچ جھوٹ دیکھنے کی غرض سے چرخہ کاتنے والی لڑکی کے پاس آپہنچا۔ تو کیا اس سے جوگی کی تپسیا بھنگ ہوگئی؟

جوگی چرخہ کاتنے والی عورت کے پاس آگیا تو کیا ہوا؟ گاؤں کی بہو بیٹی بدستور چرخہ کاتتی رہی ہوگی، دل ہی دل میں وہ خوشی خوشی اپنی کارستانی کا خیال کر رہی ہوگی۔ کون تھا یہ جوگی؟ دل پوچھتا ہے۔ کہیں یہ بات تو نہ تھی کہ ہماری کہانی کا شہزادہ سات سمندر پار کی شہزادی کی تلاش میں مایوس ہوکر جوگی بن گیا تھا، اور پھر ایک دن چرخہ کی گونج سن کر دیہاتی شہزادی کے پاس آپہنچا تھا! کسی ایسے ہی موقع پر بھرتری ہری نے کہا تھا "عورت کے دل کو جکڑنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ آئینہ میں عکس کو باندھنا۔ عورت کے راستے دشوار گزار ہوتے ہیں، اونچے پہاڑوں کی پگڈنڈیوں کی طرح۔ اس کے جذبات اوس کے قطروں کے ہم پلہ ہیں، جو صبح کے وقت پھول پتوں پر لٹکتے نظر آتے ہیں۔ عورت کی غلط فہمیاں اس کے ساتھ اسی طرح چمٹی رہتی ہیں، جیسے انگور کی بیل پر زہریلی بوٹی!" جوگی کے خون میں ایک طوفان سا لہریں مارنے لگتا ہے۔ وہ کہہ اٹھتا ہے، عورت سچ مچ "مایا" ہے۔ اور چرخہ کاتنے والی کا گیت جاری رہتا ہے:

"ہر چرخے دے گیڑے
ہتّراں نوں یاد کراں!"

— 'چرخے کے ہر چکّر کے ساتھ میں اپنے دوست کو یاد کیا کرتی ہوں!'
جوگی دُور سے یہ سُندر گیت سُنتا ہے اور سوچتا ہے، عجب دل لگی ہے
کہ عشق کے نغمے گانے والی دوشیزہ میری طرف دیکھتی تک نہیں! تو پھر
وُہ کس دوست کو یاد کر رہی ہے؟
جوگی اپنی راہ لیتا ہے۔ عورت کے گیت جاری رہتے ہیں:
"جند تیرے حوالے کیتی
جنددیاں وَٹّ پُونیاں!"

— 'اپنی زندگی میں نے تیرے حوالے کر دی ہے، میری اس
زندگی (کو روئی سمجھ لے اور کاتنے کے لئے اس) کے گالے بنا لے!'
عورت کا ایثار ہی سچ مچ اُس کی محبت کی جان ہے:
"تند تیریاں غماں دے پاواں
چرخہ میں آپنا کتّاں!"

— 'میں تیرے غموں کے تار نکالتی ہوں، حالانکہ سُوت میں اپنے چرخہ
پر کات رہی ہوں!'
عورت اپنے محبُوب کا غم نہیں برداشت کر سکتی۔ وہ چرخہ کاتتی جاتی ہے

اور اُس کے ہجر میں آنسو بہاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دِل کے چرخہ پر غم و ہجر کی روئی کات رہی ہے۔

پہاڑ کے قدموں سے ٹکرا کر اپنا بہاؤ بدلتی ندی کی طرح چھلوگا نے گاتے اپنے نغموں کا رُخ بدلتی رہتی ہے۔ ٹھنگنی لڑکی کا گیت دن میں چار پانچ بار تو ضرور ہی گا لیتی ہو گی:

"مدھری رَن دا کی صلاحنا
جیوں چرخے دا مُنّا
ٹُردی پھِردی نظر نہ آوے
بیڑھا سُنم سُنّا"

— ٹھنگنی عورت کی کیا تعریف کی جائے؛ چرخہ کے پائے سی تو ہے وُہ! چلتی پھرتی وہ نظر نہیں آتی، آنگن سُونا معلوم ہوتا ہے۔

کِسان اور اُس کی بیوی صدیوں سے خوابوں سے بوجھل گیت گاتے آ رہے ہیں۔ ہر وہ شخص جو ہل اور چرخہ کی شاعری سُننا چاہتا ہے، جو پُرانے تمدن کے اچھُوتے بول سُننا چاہتا ہے، ایک بار ہمارے گاؤں میں آ جائے۔ صدیوں سے کِسان عورت کی آواز گونجتی چلی آ رہی ہے:

"میرا اُئے چل چرخہ او تھے
وے جتھے تیرے ہل وگدے!"

—" میرا چرخہ وہاں لے چل جہاں تیرا ہل چل رہا ہے"
آج بھی کسان عورت کے پاس ٹھوس حقیقت کو الفاظ میں منتقل کر دینے والی یہ قوت موجود ہے، صرف تفریح ہی پریم کا رنگ نکھرتا ہو یہ بات نہیں۔ خاوند ہل چلاتا رہے، اور کھیت کے کنارے جھونپڑی کے دروازے پر بیوی چرخہ کاتا کرے، اور اس طرح اُس کی آنکھیں محبوب کو بیج کے لئے کھیت تیار کرتے دیکھتی رہیں — زندگی کی یہ تصویر ایک نئی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ بھلے ہی گرم ہوائیں چلیں، سُورج آگ برسائے، کسان کی خوش نصیبی میں کیسے شک ہو سکتا ہے جبکہ اُس کا بہترین سرمایہ — بیوی کا مکھڑا — چار قدم پر موجود ہے۔ چرخہ اور ہل دیہاتی زندگی کے دو زبردست پہیے ہیں۔ "جب آدم ہل چلایا کرتا تھا اور حوا چرخہ کاتتی تھی، تب آج کا "جنٹلمین" کہاں تھا؟" [1] پُرانے انگریزی گیت میں چرخہ اور ہل کی اہمیت تہذیب کے بنیادی معیار پر روشنی ڈال رہی ہے۔

حوا کی بیٹی آج بھی چرخہ کاتتی ہے۔ اور چرخہ کے گیت، جنہیں گاتے چھلو کبھی تھکتی نہیں، ایک ایسا بے نظیر مقامی رنگ لئے ہوئے ہیں جو وطنیت کے پیچھے چلنے والی ترقی پسند شاعری کی جان ہوا کرتا ہے۔

[1] "When Adam delved and Eve span
Where was then a gentleman?"

خاص کر وہ چرخہ جو ماں سے مِلا ہو، جُوں جُوں پُرانا ہوتا جاتا ہے اُس کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ یقین نہ ہو تو سُسرال میں چرخہ کاتتی دُلھن کا گیت سُن لیجیے چھلّو کی زبانی:

"ماں میری نے چرخہ دِتّا
وِچ سیو نے دیاں میخاں!
نی مائے! تینوں یاد کراں،
جد چرخے وَل ویکھاں!!"

— 'میری ماں نے مجھے یہ چرخہ دیا تھا۔ اس میں سونے کی میخیں لگی ہوئی ہیں۔ امّاں! میں تجھے یاد کیا کرتی ہوں، جب بھی مجھے یہ چرخہ نظر آ جاتا ہے!'
جب چھلّو کی شادی ہو جائے گی تو وہ شاید اس گیت کو اپنی سوانح عمری کا ایک ورق بنا لے گی۔ یہ ہے مادری محبّت کی یاد، جس کے زیرِ اثر چرخہ میں لگی ہوئی پیتل کی میخیں سونے کی معلوم ہوتی ہیں۔
غریبوں کے چرخے کیکر کی لکڑی سے تیار ہوتے ہیں۔ جس کا باپ یا خاوند امیر ہو وہ شیشم کا چرخہ پا کر پھولی نہیں سماتی۔ چرخہ خوبصورت نہ ہو تو کاتنے کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

"چرخہ میرا رانگلا
تند کڈھاں دریاؤ!"

—— میرا چرخہ رنگین ہے اور میں دریا (جتنا لمبا) تار نکالتی ہوں!'

خوش قسمت دُلھن کا یہ گیت گاتے گاتے تنجن کی سہیلیاں فخر سے اپنا سر اُونچا کر لیتی ہیں۔ دیہات کی جدت پسند شاعری کھیتوں اور تنجنوں میں پلی ہے، اِس نے دریاؤں کی روانی دیکھی ہے۔

۲

چھلّو چرخہ کات رہی ہے۔ اُس کے چرخہ کی رفتار کبھی سُست نہیں پڑتی روز بروز، لمحہ بہ لمحہ اس میں سمجھ بُوجھ پیدا ہوتی گئی ہے۔ مگر آج بھی اُسے بچپن کے وُہ دن بھُولے نہیں جب وہ اپنی ماں کے چرخہ کے سامنے بیٹھ کر ماں کی طرح باریک تار نکالنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ ماں کہتی "نا چھلّو ابھی تو بچّی ہے۔ خدمت کر بیٹی۔ اُٹھ کھڑی ہو یہاں سے۔ دیکھنا تکلا مت خراب کر دینا۔" چھلّو نہ مانتی، ماں گھُورتی، اور پھر چھلّو رونے لگتی۔ مَیں نے خود اُسے روتے دیکھا تھا۔ اُس کے اصرار پر اُس کی ماں کہہ رہی تھی "میں تجھے ایک چرخی منگوا دوں گی۔" "مَیں رنگین چرخی لُوں گی" چھلّو کہہ رہی تھی۔ "اچھا رنگین ہی سہی" —— ماں کے مُنہ سے یہ الفاظ کہلوا کر کہیں چھلّو چُپ ہوئی تھی۔ آج وہ بچپن کے دن بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

چھلّو کا گھر دُور نہیں۔ ہماری اس گلی میں وہ سامنے کا گھر، جہاں چھلّو پیدا ہوئی، جہاں اُس نے چرخہ کاتنا سیکھا، جہاں چرخہ کے گیت اُس کی

زبان پر چڑھے اُس کی شادی کے بعد بالکل اُداس ہو جائے گا، اور وہ وقت اب بہت دُور نہیں۔ تنجن تو اُس کی غیر حاضری میں بھی لگا کریں گے، مگر چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر چھلّو کی ماں ہمیشہ اپنی بیٹی کی جُدائی محسوس کیا کرے گی۔

چرخہ کاتتی چھلّو کا آنچل اُس کے کندھوں سے سرک کر ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ وہ تنجن کی رانی ہے۔ تنجن تو میں نے اپنے ہی گاؤں میں سینکڑوں دیکھے ہیں مگر جو تنجن چھلّو کے آنگن میں جمع ہوتا ہے، اُس کی رنگینی اور رونق کا کیا مقابلہ! اس تنجن کی خاص خوبی یہی ہے کہ یہاں کبھی گہرے کہرے کی طرح خاموشی نہیں چھائی رہتی۔ حق تو یہ ہے کہ چھلّو سے بڑھ کر گانے والی لڑکی ہمارے گاؤں میں آسانی سے نہ مل سکے گی۔

"جب بیٹا پیدا ہوتا ہے، گھر کی دیواریں کانپ اُٹھتی ہیں، کہتی ہیں دنیا برخوردار آ رہا ہے۔ کون جانے وہ ہماری خوبصورتی میں اضافہ کرے گا یا ہمیں اُکھاڑ پھینکے گا!" — پنجاب کے کسان یہ بات بڑے شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ لڑکی کی پیدائش سے متعلق ایسی کوئی بات میرے سننے میں نہیں آئی۔ لڑکی سے والدین کے گھر کی دیواریں بھلا کیوں ڈرینگی! ایک دن وہ اِس گھر کو خیرباد کہہ کر سُسرال کی راہ لے گی۔

ایک ایک کر کے تنجن میں جمع ہونے والی سب کی سب کنواری لڑکیاں

بیاہی جائیں گی۔ اُن کی جگہ دُلھنوں کو ملتی جائے گی۔ چھلّو کا کوئی بھائی ہوتا تو اُس کی ماں اسی اُمید پر خوشی منا سکتی تھی کہ ایک دِن چھلّو کی غیر حاضری سے پیدا ہونے والی اُداسی اُس کے بیٹے کی بہو آنے پر رفع ہو جائے گی۔ بچپن کی سہیلیاں، جو ایک ساتھ تنجن میں جمع ہوتی رہیں، بیاہ کے بعد بھی میکے آتی رہیں گی، لیکن سب کی سب تو پھر اکھٹی نہیں ہو سکتیں:

"پُور بیڑی دا تنجن دیاں کُڑیاں،
سب نال ہون کٹھیاں!"

— کشتی میں ایک ساتھ پار ہونے والے مُسافر اور تنجن میں ایک ساتھ چرخہ کاتنے والی لڑکیاں، بڑی مشکل سے اکٹھی ہوتی ہیں!

چھلّو اُس دُلھن کا گیت دُہرایا کرتی ہے جس نے سُسرال کے راستہ میں کہا تھا:

"لگیاں تنجن دیاں
مینوں یاد گڈی وِچ آئیاں!"

— "تنجن میں پیدا ہوئے پیار مجھے اب اِس بَیل گاڑی میں بیٹھے یاد آرہے ہیں!"

اور اُسے کسان دُلھن کا وہ یاس انگیز گیت بھی یاد ہے جس میں اُس نے ایک بار میکے میں لوٹ کر گھر کے پچھواڑے میں کھڑے بڑ کے

درخت سے پوچھا تھا کہ اُس کی چھاؤں میں جمع ہونے والے تنجن کہاں چلے گئے؟ اور بوڑھے برڑنے، جس نے اپنے نیچے ہزاروں تنجن دیکھے تھے، جواب دیا تھا:

"کچھ سوہرے کچھ پیوکڑے
کچھ لمے راہ پئے!
بھریاں صُراحیاں رہ گئیاں
پیالے کول پئے!!

— کچھ لڑکیاں سسرال چلی گئی ہیں، کچھ ابھی یہاں اپنے میکے ہی میں ہیں، اور کچھ (موت کے) لمبے راستے پر چلی گئی ہیں۔ بھری ہوئی صراحیاں رہ گئیں، ہائے! پیالے بھی اُن کے پاس پڑے رہ گئے!"

زندگی اور موت کے دوراہے پر پیدا ہونے والے گیتوں میں خود بخود صوفیانہ رنگ آجاتا ہے۔ چاہئے تو یہ کہ تنجن کی ہر لڑکی "موت کے لمبے رستے" پر گامزن ہوتے وقت شاعر کے الفاظ میں یہ کہہ سکے "اے میری دُنیا! اجنبی کی طرح مَیں تیرے کنارے پر آئی، مہمان کی طرح تیرے گھر میں رہی، اور اب مَیں تجھے ایک سہیلی کی طرح چھوڑ رہی ہوں۔"

۳

کئی سال کی خانہ بدوشی کے بعد حال ہی میں جب میں اپنے گاؤں

پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ چھلو اب وہاں نہیں ہے۔ وہ اپنی سسرال میں رہتی ہے۔ اور یہ جان کر میں بہت حیران ہوا کہ ہماری گلی کی سب کی سب عورتیں چھلو کی غیر حاضری میں بھی بدستور خوشی خوشی تنجن میں جمع ہوا کرتی ہیں، اور تو اور، چھلو کی ماں بھی اتنی اُداس نہیں جتنی میرے اندازہ کے مطابق وہ ہونی چاہئے تھی۔

گھر کے کھلے آنگن میں چرخہ کاتنے والیوں کی بزمِ سخن روز بروز ہمارا من موہنے کے لئے جمی رہتی ہے۔ بیسیوں لڑکیاں بیاہ کے بعد اس تنجن سے الگ ہو جاتی ہیں۔ بیسیوں دلھنیں اُن کی جگہ خانہ پُری کے لئے آ حاضر ہوتی ہیں۔ تنجن قائم رہتا ہے اور گھر کا آنگن سمندر کے ساحل کی طرح ہوتا ہے جہاں چمکتی ریت صدقِ دل سے نئی نئی لہروں کے انتظار میں پڑی رہتی ہے۔ چرخہ کاتنے والی ہر بہو بیٹی ایک ایک لہر ہی تو ہوتی ہے۔

چھلو وہاں اپنی سسرال میں کیا سوچ رہی ہو گی؟

اس پہاڑ کی وہ گونج اُس پردیس میں کیا کبھی بچپن کی سہیلیوں کو یاد نہ کرتی ہو گی؟ کبھی وہ اپنی ماں کے آنگن میں کوئل کی طرح کُوک کُوک کر گایا کرتی تھی:

"گونجے پہاڑ دیئے،

کدے یاد ملناں دل پھیرا!"

”پہاڑ کی کونج! کبھی تو اپنے وطن کی طرف بھی آ!“

ہائے! آج وہ خود کونج بن کر اپنے میکے سے اُڑ گئی!

ہاں، تو چھلو کی غیر حاضری میں بھی چرخوں کی گھوں گھوں قائم ہے۔ رات کے وقت چاند بدستور ہمارے گاؤں کے مکانوں پر اپنا آشیرواد بھیجتا ہے۔ ستارے بھی ہمارے گھروں کی طرف پہلی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ قدرت کے نظام میں گاؤں کی کسی ایک لڑکی کے آنے جانے سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ مگر ہائے! چھلو چلی گئی اور میرا دل اُداس ہے۔ چاند کیوں اُداس نہیں؟ ستارے میری اُداسی میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ ٹھیک، چاند اور ستارے تو اُسے اُس کی سسرال میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

چھلو کے آنگن میں اُس سے کچھ گیت سُن لکھ چکنے کے بعد میں نے جو الفاظ کہے تھے وہ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ بسنت پنچمی کا دن تھا۔ سرسوں کے کھیت کی سی طراوت اُس کے بشاش چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ ”چھلو اب سیانی ہو رہی ہے!“ میں نے کہا تھا۔ سرسوں کا پھول، جسے میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، کہہ رہا تھا ”سیانی ہی نہیں ہو رہی، چھلو نکھر بھی رہی ہے!“ چھلو کی ماں مسکرا رہی تھی، اور خود بہن چھلو بھی جس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی۔

میں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ چھٹکو کی یاد میں میں اتنا اداس ہو جاؤں گا۔ آج وہ مجھے نظر آجائے تو میں شاعر کے الفاظ میں اس سے کہہ دوں "تو مسکرا دی، اور تو نے میرے ساتھ کوئی بات چیت نہ کی، اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک مدت سے تیری مسکراہٹ کا انتظار تھا!"

اپنی سسرال میں بھی وہ انجن کی رانی ثابت ہوئی ہو گی۔ شاعری کے وہ سب جواہر پارے، جو ان گنت نسلوں کے بعد سینہ بہ سینہ اس تک آ پہنچے ہیں، بدستور اس کی زبان پر ہوں گے، اور مجھے یقین ہے کہ اس کا خاوند اس کے لئے ایسا ہی ثابت ہوا ہو گا جیسا ہماری کہانی کا وہ شہزادہ جو سات سمندر پار کے نامعلوم جزیرہ کی شہزادی سے شادی کرنے کی دھن میں دیوانہ ہو گیا تھا۔

ٹ ٹیگور

۱۲

لاجی

"اے حسینہ! اپنی اصلیت پیار میں کھوج، آئینہ کی چاپلوسی میں نہیں!"
شاعر ٹیگور نے کہیں لکھا ہے۔ مگر یہ کوئی نئی آواز نہیں۔ سینہ بہ سینہ ان گنت صدیوں سے، سینکڑوں نسلوں سے یہ آواز عورت تک پہنچتی رہی ہے خود اپنے خاوند کی آواز میں بھی اُس نے اکثر آئینہ کی چاپلوسی پائی ہے۔ عورت کو سطحی انداز سے دیکھنا کتنا آسان ہے۔ بہت کم ہیں جو اُس کا چہرہ نہیں دیکھتے، دِل دیکھتے ہیں۔

الاؤ کے سُرخ اور سُنہری شعلے اُوپر آسمان کی طرف مُنہ کئے ہوئے ہیں،

اور جاڑے کی رات آنکھیں کھولے پڑی ہے۔ سب کے سب چمار، جن کی رگیں اور پٹھے دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد الاؤ کی گرمی میں نئی زندگی محسوس کر رہے ہیں، مدھ بھرے سنگیت کی باٹ جوہ رہے ہیں۔

یو۔پی کے دیہات میں جنہوں نے کبھی چماروں کی محفلیں دیکھی ہیں، وُہ جانتے ہیں کہ کس طرح اُن کے گیتوں کے اثر تلے انگڑائی لے رہی رات بھی کچھ گھنٹوں کے لئے نیند کو دُور ہی سے سلام کہہ دیتی ہے۔ جب ڈھولک بجنے لگتی ہے ساری فضا اس کی تھرکن پر ناچ اُٹھتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہاں کوئی غربت باقی رہی ہے، نہ کوئی غلاظت، سماج کے یہ اچھوت، جن کی آنکھوں میں بے بسی اپنی دردبھری کہانی لکھتی رہتی ہے۔ الاؤ پر جمی اس محفل میں جیسے دھرتی ماتا کا آشیرواد پا لیتے ہیں ــــ وہ آشیرواد جنہیں شاید دن کے وقت ۔۔۔ اُونچی ذاتوں کے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں، وہ نہ دے سکے!

"گیت کو چلنے دو۔"

"کونسا گیت؟"

"وُہی لاچی والا۔"

یہ لاچی کیا بلا ہے؟ میں سوچ رہا ہوں۔ گیت شروع ہونے میں شاید ابھی کچھ دیر ہے۔ نارنجی لپٹیں اُوپر اُٹھ رہی ہیں۔ شاید وہ بھی لاچی سے

واقف ہونا چاہتی ہیں۔ کیا لاچی کوئی شہزادی تھی؟ کیا اُس کا مُکھڑا الاؤ کے سُنہری شعلوں سے بازی لے سکتا تھا؟

"مہوآ تو آج ہے نہیں۔"

"مہوآ کے بغیر سنگیت کا کیا رس؟"

"تو لاچی کا گیت کیا صرف مہوآ ہی جانتا ہے؟"

ساری محفل میں شور پڑ گیا۔ ڈھولک پھر بجنے لگی۔ الاؤ کی سُنہری روشنی میں کالے کلوٹے آدمی بھی کتنے بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ گورے چِٹے آدمی اس محفل میں کھوجنا نری غلطی ہوگی۔ مگر میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حُسن کی دیوی اِن دھرتی کے بیٹوں کو اپنے رتن نہیں بخشتی۔

کتنے خوش ہیں یہ لوگ، جیسے ماضی، حال اور مستقبل کے سب کے سب سُپنے سچ ہو گئے ہوں۔ کتنا مذاق، کتنی چٹکیاں، کتنے قہقہے، کتنے لطیفے!۔ یہ سب اِس الاؤ کے شعلے ہیں، جو اُن کی دلی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ہماری کہانی کے ساتوں کے ساتوں شہزادے اِن چاروں کی بے فکری پر رشک کر سکتے ہیں۔

"لاچی کا گیت تو لچھمن کی بھابی جانتی ہے۔"

"تو لچھمن کی بھابی ہی گا دے۔"

ساری محفل کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے۔ اور خود لچھمن کی بھابی بھی ہنس رہی

ہے۔ سر پر پورنماشی کا چاند چمک رہا ہے۔ ستارے بھی دھرتی والوں کی اِس محفل کی طرف رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

پھمن کی بھابی کوئل کی طرح کوک رہی ہے:

برہے برسوا ک لچیا سُنریا رے نا

لچیا کھرکی بیٹھی لیئی بیُربا رے نا

—'حسینہ لاچی بارہ برس کی ہے'

کھڑکی میں بیٹھ کر لاچی ہوا کھا رہی ہے!'

گھوڑوا چڑھل آویں ایک راجپوتوا رے نا

راما پڑی گئی لیں لاچی پہ نظربا رے نا

—'گھوڑے پر چڑھ کر ایک راجپوت آ نکلا۔

لاچی پہ اُس کی نظر پڑ گئی!'

گھوڑوا ت باندھے راجہ کدمے کی ڈاریا رے نا

راجہ چلی گئی لیں کُٹنی محلیا رے نا

—'راجہ نے اپنا گھوڑا کدمب کی شاخ سے باندھ دیا

اور راجہ کُٹنی کے محل کو چلا گیا!'

ڈیوڑیوں میں کُٹنی رے پانچ موہریا رے نا

کُٹنی لچیا بھورئی لئی آووں رے نا

— اے کُٹنی! مَیں تجھے پانچ اشرفیاں دوں گا۔
اری او کُٹنی! لاچی کو بہکا کر لے آؤ!'

کیسے کے لچیا کے بھوروُوں راجپوتوا رے نا
راجہ لچیا سووے سوامی کو رووا رے نا

— او راجپوت! لاچی کو کیسے بہکاؤں؟
او راجہ! لاچی تو اپنے خاوند کی گود میں سوتی ہے!'

ہتھوا لے اُو کُٹنی رچھری گو اِنٹھیا رے نا
کُٹنی اگیا اوڈھر لچیا بھورڈُو رے نا

— ہاتھ میں اُپلے لے لو، او کُٹنی!
او کُٹنی! آگ لینے کے بہانے لاچی کو بہکا لاؤ۔

بھیتر باٹُو کی باہر لچیا رے نا
لچیا سب سکھی جاتھیں نہوُنے رے نا

— لاچی اندر ہو یا باہر؟
اری او لاچی! سب سکھیاں نہلنے جا رہی ہیں۔'

اتنی بچن سُنی لچیا لونگیا رے نا
ساسُو جاتی باٹی سگرے نہوُنے رے نا

— اتنی بات سُن کر وہ لونگ سی لاچی ساس سے بولی،

میں تالاب پر نہانے جا رہی ہوں؛

سگرے کی پنیا ہُواری لاگے پتر ہینگوا رے نا
بہُواری گھر ہیں کرو اسنوا رے نا

— 'تالاب کا پانی تو چبھ جاتا ہے' اوری پتلے جسم والی!
اری او دُلھن! گھر پر ہی نہا لو!'

گڈوُ ای کھیدت موری لہُوری نندیا رے نا
نندی جات باٹی سگرے نہُونے رے نا

— اری او گڑیا کھیلتی میری چھوٹی نند!
او نند! میں تالاب پر نہانے جا رہی ہوں؛

بھَوجی بابا مورا سگرا کھودَے ہیں رے نا
بھَوجی بھیّا مورا گھٹوا بندھے ہیں رے نا

— اری او بھابی! میرا باپ نیا تالاب کُھدوائے گا۔
او بھابی! میرا بھائی راس تالاب کا گھاٹ تیار کرائے گا؛

تب موری بھَوجی توُں سگرے نہا اُو رے نا
بھَوجی گھر ہیں کرو اسنوا رے نا

— تب اے میری بھابی، تم اس تالاب میں نہانا۔
او بھابی! آج تو گھر میں ہی نہالو؛

کیہو کہ کہنوا لاچی من ہی نہ آوے رے نا
لاچی کھولی لہیں رنگولی پیرڈیا رے نا
—کسی کی بھی بات لاچی کے من نہ لگی
لاچی نے اپنی لال رنگ کی پٹاری کھول لی!
اوڑھی پہیری لچیا آئی اوسردا رے نا
ساسو جاتی باٹیوں سگرے نہنوا رے نا
—پہن اوڑھ کر لاچی برآمدے میں آئی
اور ساس جی! میں تالاب پر نہانے جا رہی ہوں۔
جہاں جہاں لچیا کرے بیٹھکوا رے نا
تہاں تہاں راجہ گھوڑ ٹھمکاویں رے نا
—(راستہ میں) جہاں جہاں لاچی سستانے لگتی ہے۔
وہاں وہاں راجہ اپنا گھوڑا ٹھہرا لیتا ہے!
بڈو کیا لچیا مرئی اُو نہ پائے رے نا
راجہ اِتنے میں چُنری اُٹھاویں رے نا
—لاچی نے ابھی ایک بھی ڈبکی نہیں ماری،
راجہ اُس کی چُنری اُٹھانے لگا!
دیوں نہ راجہ کا ہیں ہمری چُنریا رے نا

راجہ مور مانسو کھائیں مچھریا رے نا
"اور راجہ! تم میری چُنری کیوں نہیں دیتے؟
راجہ! مچھلیاں میرا ماس نوچ رہی ہیں!"
جو ہم دیئی لچیا توہری چُنریا رے نا
لچیا ہمرے گوہنوا چلی چالنُو رے نا
"لاچی! اگر میں تمہاری چُنری دے دُوں،
تو اری او لاچی! میرے گھر میں چلی چلو نا!"
جو ہم چلی راجہ توہرے گوہنواں رے نا
راجہ توہیں لے سُندر مور بیاہوا رے نا
"راجہ! تمہارے ساتھ میں کیوں چلوں گی؟
تم سے کہیں زیادہ حسین ہے میرا خاوند!"
جے کے مرر مرر کرے جُتوا رے نا
جے کے ایڑیا برن پردنیا رے نا
"چلتے وقت، جس کی جوتی مرر مرر کرتی ہے،
اور جس کی ایڑی کی طرح لال کنارے دار دھوتی ہے"
یتنا سُنت راجہ مُونھہ بچو کائے نی رے نا
لچیا تُوہیں نے سُندری موری بیاہیا رے نا

— اتنی بات سُن کر راجہ کا چہرہ اُتر گیا۔

اری او لاچی! تم سے کہیں حسین تو میری بیوی ہے!

جے کے بھہر بھہر کری بروا رے نا

جے کے مُنری برن کری ہنیاں رے نا

— جس کے بال چمکتے ہیں،

جس کی کمر انگوٹھی کی طرح گول ہے!

گیت ختم ہو گیا ہے سارا محفل شاباش کی صدا بلند کر رہی ہے۔ لاچی کی وفا شعاری کی یہ تصویر، جو مجھے اس میں دیکھنے کو مل گئی ہے مجھ پر وجدانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ لاچی تھی کون؟ کیا وہ ایک چمار عورت تھی؟ چمن کی بھابی سی، جس نے یہ گیت بڑے مزے دارئے میں گا سنایا ہے؟ لاچی نے راجہ کی جنسی خواہش سُن کر اُسے جلی کٹی باتیں سُنانے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ بلکہ اُس نے اُسے یہ بتلا کر کہ اُس کا خاوند اُس سے کہیں حسین ہے، اپنا جذبہ اُس پر ظاہر کر دیا۔ گُٹنی نے ٹھیک ہی تو بتلایا تھا کہ لاچی اپنے خاوند کی گود میں سوتی ہے یعنی اُس پر وہ کسی غیر مرد کو ترجیح نہ دے گی۔ لاچی گاؤں کی بیٹی ہے اور خاوند کے جُوتے کی مرمر آواز پر اور لال کنارے دار دھوتی پر سو جان سے قربان ہو رہی ہے۔ اتنی دُور اُس کا پیچھا کرنے کے بعد راجہ بھی بہت مایوس ہوا۔ وہ بہت شرمندہ بھی ہوا، من ہی من میں۔ اس شرمندگی

کی حالت میں اُسے اپنی رانی کی یاد آئی جو لاچی سے کہیں زیادہ حسین تھی۔

"دونوں کا دھرم بچ گیا۔"

"جی ہاں، لاچی اور راجہ دونوں کا دھرم بچ گیا۔"

"مہوآ کی بیوی کو لاچی کا ایک دوسرا گیت یاد ہے۔"

"چلنے دو وہ گیت بھی۔"

"ہاں، چلنے دو۔"

ڈھولک پھر بجنے لگی ہے۔

"مہوآ کی بیوی! گاؤ نا پھر۔"

ساری محفل ہنس پڑی ہے۔ ڈھولک اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ الاؤ کے شعلے بہت اونچے اُٹھنے لگے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں — مہوآ کی بیوی! گاؤ نا پھر!

اور مہوآ کی بیوی نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے گیت شروع کیا ہے، وہ اِتنے زور سے گا رہی ہے کہ گاؤں بھر کے آدمی اُس کی آواز سُن سکیں۔

اپنی کھڑکیا پچیا جھارے لاگیں کیسیا ہو نا

پچیا پڑی گیلے جے سنگھ نجریا ہو نا

— اپنی کھڑکی پر بیٹھ کر لاچی اپنے بال جھاڑ رہی ہے۔ لاچی پر جے سنگھ

کی نظر پڑ گئی۔

اپنی کھڑکیا رچپا کرے دتوُاِنیا ہو نا

رچپا پڑی گیلے جے سنگھ چھِٹکوا ہو نا

—' لاچی اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر داتن کر رہی ہے۔ لاچی رکی داتن کے چھینٹے جے سنگھ پر پڑ گئے'۔

اوتے چلُو اور نے علُو جے سنگھ رجوا ہو نا

جے سنگھ پڑی جیہیں دتوُون چھٹکوا ہو نا

—' پرے ہٹ جاؤ، پرے ہٹ جاؤ، راجہ جے سنگھ! او جے سنگھ! داتن کے چھینٹے پڑ جائیں گے'۔

اوتوُ نہ موری لاچی ہمری سیجریا ہو نا

لاچی رانی ہوئی کے سب سُکھ بلسو ہو نا

—' لاچی! میری سیج پر آجاؤ نا۔ اری او لاچی! رانی ہوکر سب مزے لوٹو!

ای سنی بول جنی بولہو رجوا جے سنگھ ہو نا

راجہ ہم تو دھرم کے بیٹیا ہو نا

—' راجہ جے سنگھ! ایسی بات مت بولو۔ او راجہ! میں تو تمہاری دھرم کی بیٹی ہوں!'

اُوہواں سے گئی لے جے سنگھ کٹنی محلیا ہو نا

بڑھیا لاچی کے بھورنی موہی آن ہو ہو نا

—" وہاں سے چل کر جے سنگھ کٹنی کے محل میں پہنچا (اور بولا) اری بڑھیا! لاچی کو بہکا کر لے آؤ! "

لچیات کتلے رجوا سوامی جی کے کوروان ہو نا

رجوا چھو لے جہینہ کے الونتیا ہو نا

—" لاچی تو اپنے خاوند کی گود میں سوتی ہے۔ اور راجہ! وہ تو چھ ماہ کی گربھ وتی ہے "

لیہو ن کٹنی رے ڈال بھری سولوا ہو نا

کٹنی لاچی کے بھورانی موہیں آنہو ہو نا

—" اری کٹنی! ڈلیا بھر کر سونا لے لے۔ او کٹنی! لاچی کو بہکا کر لے آؤ! "

ہتھوا کے لےلیں بڑھیا گوئیں کٹا چپریا ہو نا

بڑھیا آگیا بہانے لاچی کہاں ائی لی ہو نا

—" بڑھیا نے ہاتھ میں گوبر کی تھپکی لے لی۔ آگ لینے کے بہانے بڑھیا لاچی کے گھر آئی "

باہر باڈو کی بھیتر لچیا الونتیا ہو نا

لچیا سب سکھی جالے تہنوا ہو نا

—" باہر ہو یا اندر، او گربھ وتی لاچی؟ لاچی! سب سکھیاں گنگا اشنان

کے لئے جا رہی ہیں۔

برہا برس پر لگلی، ترِ مقوا ہو نا
لاچی تہوں چاہبو گنگا اسنواں ہو نا

— بارہ سال کے بعد یہ تیرتھ کا دن آیا ہے۔ لاچی! تو بھی گنگا اشنان کے لئے چل۔

پچیا بیٹھلی تہوں ساسُو بڑھے تن ہو نا
ساسُو ہم جیبو گنگا اسنوا ہو نا

— اے پچیا پر بیٹھی ساس! میری بزرگ!! ساس! میں گنگا شنان کے لئے جاؤں گی۔

اِتنی بولی جنی بولھُو بہُو آ ہو نا
بہُو آ مچھو رے مہینہ کے اوُنتیا ہو نا

— بہو! تو اتنی بات مت کر۔ بہو تو تو چھ ماہ کی گربھ وتی ہے۔

ایک کوسے گئی لی لاچی دُئی کوسے گئی لی ہو نا
راما پڑی گئی لے جے سنگھ نجریا ہو نا

— ایک کوس گئی، لاچی دو کوس گئی۔ اور رام! اُس پر جے سنگھ کی نظر پڑ گئی۔

اُدھواں سے جے سنگھ بھیجے ہرکروا ہو نا

راما تا ہی پیچھے گھوڑ اُڑ دے ہو نا

"وہاں سے جے سنگھ نے ہرکارا بھیجا (لاچی کو روکنے کے لئے) اور رام! اس کے بعد اُس نے اپنا گھوڑا دوڑایا۔"

گھوڑا سے اُتری جے سنگھ لاچی کہاں ائی لے ہو نا

جے سنگھ لپکی دھئی لے داہن بہیاں ہو نا

"گھوڑے سے اُتر کر جے سنگھ لاچی کے پاس آیا۔ لپک کر جے سنگھ نے اُس کی بانہہ پکڑ لی۔"

چھوڑو چھوڑو جے سنگھ ہمرو انچروا ہو نا

جے سنگھ توہرا سے سُندر مور رجوا ہو نا

"چھوڑو، چھوڑو! جے سنگھ! میرا آنچل چھوڑ دو۔ جے سنگھ! میرا راجہ تم سے کہیں حسین ہے!"

ائی سنی بولی جنی بولو رانی لچھیا ہو نا

لاچی چلی چلُو ہمری سیجریا ہو نا

"او لاچی رانی! ایسی بولی مت بولو۔ لاچی! میری سیج پر چلی چلو نا!"

اتنا بچن لاچی سُنہی نہ پولی ہو نا

لاچی کاڈھی کٹریا رجیوا لیہلی ہو نا

"اتنی بات ابھی لاچی نہ سُن پائی تھی۔ لاچی نے کٹار نکال لی اور

اُس نے رجے سنگھ) کو مار ڈالا۔

اُوہواں سے چلی لاچی گھر کے پہنچلی ہو نا

اِما ساسُو گری آوے بابا مُوانی ہو نا

—— وہاں سے چل کر لاچی گھر پہنچی۔ اور ام ا ساس کہتی ہے۔ تیرا بابا مرجائے (تو اب تک کہاں تھی ؟)

جنی ساس بابا کھاہُو جنی ساسُو بھیّا کھا ہُو ہو نا

ساسُو بٹیا روکیلا ہٹ پروا ہو نا

—— نہ اے ساس، میرے بابا کو کھاؤ۔ نہ اے ساس، میرے بھائی کو کھاؤ۔ اوساس! راہ میں ڈاکو نے روک لیا تھا۔

گیت ختم ہو گیا الاؤ کی سُنہری لپٹوں کی روشنی میں مَیں مہوآ کی بیوی کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے بیچ میں بڑی شان سے بیٹھی ہے۔ جیسے وہ خُود ہی گیت کی لاچی ہو اور جے سنگھ کو ابھی ابھی موت کے گھاٹ اُتار کر اس گیتوں کی محفل میں آگئی ہو۔

ڈھولک کی تھرکن بند ہو گئی ہے آگ سُلگ رہی ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے ہیں لچھمن چمار اب بھی میرے پاس بیٹھا ہے۔ رات جاڑے کی انگڑائی لے رہی ہے۔

۱۳

مَیں ہُوں خانہ بدوش

بچپن میں مَیں نے ایک پنجابی گیت سُنا تھا:

"مگی دگی پڑسے دی وا

اگے اساں ٹُرنا نہیں۔

نہیں نہیں وے!

ٹُرناں نال ہیگا بھیرا

پچھے اساں مُڑنا نہیں۔

نہیں نہیں وے!

وگی پُرے دی وا

تے پچھے اساں مُڑنا نہیں !"

ــــ "چلی، لو پُورب کی ہوا چلی۔ ہم آگے نہیں چلیں گے۔ نہیں، ارے نہیں، چلنا تو بہت (باقی) ہے ہم واپس نہیں جائیں گے، نہیں، ارے! نہیں، لو پُورب کی ہوا چلی، ہم واپس نہیں جائیں گے!"

اِن الفاظ کا تعلق میری مادری زبان سے تھا۔ دیہات کی جیتی جاگتی شاعری کی یہ آواز میرے دل میں بس گئی۔

کھلی، آزاد فضاؤں کے لئے میرا دل ہمیشہ بے چین رہا ہے۔ ہوائیں مجھے اُڑائے لئے پھرتی ہیں۔ یہ ہوائیں مجھے بے حد پسند ہیں اور مَیں خوش ہوں۔ ہواؤں کے گیت مَیں نے اکثر سُنے ہیں، پچھلے سال مَیں نے اپنے گاؤں میں ایک رُوح پرور آواز والی کسان لڑکی سے ایک ننھا سا ترانہ سُنا تھا

"آئی آں مَیں وا بن کے

پنج باریاں پنجھتر بُوہے کھول کے !"

ــــ "مَیں ہوا بن کر، پانچ کھڑکیاں اور پچھتر دروازے کھول کر آنکلی ہوں"

اسی ہوا سے میرا پیار ہے۔ یہ کھڑکیاں اور دروازے کھول دینے والی ہوا! یہ چلبلی، گاتی ہوا! یہ مست الوکھی ہوا! یہ دل میں بسنے والی، سوتے پنچھی کو جگانے والی ہوا!

مَیں ہوں خانہ بدوش۔ ہوائیں مجھے اُڑائے لئے پھرتی ہیں۔
کھُلی، آزاد ہوائیں نہ جانے کتنے گیت، کتنے افسانے لئے آتی ہیں۔ رس بھرے دلوں میں پیچ و خم کھاتی، جھومتی ہزاروں راز افشا کیا کرتی ہیں۔ ان کی ناچتی لہریں! اور جب میں گاتا ہوں: "لو پورب کی ہوا چلی، ہم واپس نہیں جائیں گے!" تو جیسے پوربی میرے کان میں نئی زندگی کی مبارکباد دے جاتی ہے۔
میری بیوی میرے ہمراہ ہے۔ ایک بیٹی بھی۔
"اس شہر کا کیا نام ہے، پتاجی؟"
"اسے بیجواڑہ کہتے ہیں، کویتا!"
اسی خانہ بدوشی میں سات سال ہوئے، اڑیسہ اور آندھر دیش کی سرحد پر کویتا پیدا ہوئی تھی۔
میری بیوی کہہ رہی ہے "نئے نئے گاؤں اور شہر دیکھنے کا شوق تو کویتا کو اپنے پتاجی سے بھی کہیں زیادہ ہے!"
"جی ہاں"
ہم تینوں ہنس رہے ہیں، کھلکھلا کر!
"خانہ بدوشوں کی کہانی"[1] اُن کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ میرے ساتھ

[1] The story of the Gypsies جسے ۱۹۲۸ء میں Konrad Bercovici نے لکھا تھا۔

رہی ہیں۔ خانہ بدوش قبیلے جو یورپ میں ہر جگہ بکھرے پڑے ہیں، کسی زمانہ میں ہندوستان سے وہاں چلے گئے تھے۔ اس کتاب میں ایک گیت دیا گیا ہے جسے یہ لوگ مدت سے گاتے آئے ہیں:

"دُنیا کی دولت اور یہ ملکیت جو تمہارے پاس ہے
تمہیں اپنے نیچے دبائے رکھتی ہیں۔
اور تمہیں ختم کر ڈالتی ہیں!
محبت چاہیے کھلی آزاد ہوا سی
تازہ اور نئی روح ڈالنے والی!
ہوا کو دیواروں میں بند کر لو یہ گندی ہو جائے گی۔
کھلے خیمے، کھلے دل! ہوا کو چلنے دو!

"جاگ او سوتے مسافر!" اُڑنے کے خواب دیکھنے والا خانہ بدوش ہمیشہ یہی آواز سُنا کرتا ہے "تجھے تو آگے چلنا ہے۔ دیکھ اور مسافر تو چل پڑے تو بھی چل۔ رات گئی، دن آیا۔ دیکھ کہیں نہ پڑ جائے مایا کا سایا!" ہواؤں کا یہ پیغام میں روز سُنتا ہوں۔ مَیں ہوں خانہ بدوش۔

نکما خانہ بدوش نہیں ہوں میں۔
خود بخود ایک کام مَیں نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ گاؤں گاؤں جانا ہر صوبہ میں لوگوں کے دِلوں کا مطالعہ کرنا، اُن کے پرانے اور نئے گیت

جمع کرنا۔ جب میں اپنے ہم وطن کسانوں کے چہروں پر نظر ڈالتا ہوں، اُن کے گیت سُنتا ہوں، ہمالیہ اور گنگا کی ہم عمر مادرِ ہند، جس کے ماتھے پر ابھی جھُرّیاں نہیں پڑی ہیں، میرے ننھے معصوم دل پر ہاتھ رکھتی نظر آتی ہے عالمِ خیال میں اپنی شہد سی شیریں محبت وہ میری رگ رگ میں بھر دیتی ہے۔

مَیں گیت جمع کرتا ہُوں۔ عوام کے گیت نسل در نسل چلے آنے والے گیت۔ کھُلے، شگفتہ، سُکھی جوبن کے گیت، نیند سے بوجھل حُسن کے خواب، پریم کے ترانے، پنگھٹ کے گیت، کھیتوں کے گیت، زندگی کی ہر لہر کے گیت، دُکھ اور غریبی کے گیت۔ ہندوستان کی آپ بیتی اِن گیتوں میں موجود ہے۔

۲

مَیں ستاروں کی طرف دیکھا کرتا ہوں۔

جھلملاتے ستارے مستی میں ناچتے بہشت کے چراغ ہی تو ہیں "چمکو، چمکنا ہی زندگی ہے، دیکھو ہم ہزاروں صدیوں سے چمکتے آرہے ہیں۔ صدیوں سے ہم آدمی کو چمکنے کے لئے کہتے آرہے ہیں۔" دُور کے تارے خاموشی سے اپنی پُرانی آواز میرے کان میں ڈال جاتے ہیں۔

ٹیگور نے کہیں لکھا ہے "اے سڑک کنارے کی گھاس کی پتیو! مایوس نہ ہونا۔ ستاروں کی طرف دیکھو، پھر ایک دن ستارے پھُول بن کر تمہارے

اندر سے کھل پڑیں گے۔"

کسان ہمیشہ سے ستاروں کی طرف دیکھتا آیا ہے۔
راولپنڈی کے پاس ایک گاؤں میں میں نے ایک گیت سنا تھا:

"باغے وِچ آیا کرو!

سوہنے موہنے تاریاں دے
دو گیت سنایا کرو!"

— (باغ میں آیا کرو (پیارے) ! خوبصورت اور دل موہنے والے ستاروں کے دو گیت سنایا کرو (پیارے)۔

ترجمہ میں وہ خوبی نہیں پیدا کی جا سکتی جس سے دیہاتی موسیقی کا جادو ایک ایک لفظ میں جذبات کی تصویر کو زندہ کر دیتا ہے۔

گاؤں کی لڑکی بھی ستاروں کے گیت سننے کے لئے بے قرار ہے۔ نینوں میں کاجل لگا کر وہ جب چاند کی طرف دیکھتی ہے تو ستارے بھی اس کے سامنے ہوتے ہیں۔

جب آسمان پر "کھتیاں"[1] نظر آتی ہیں، آدھی رات بیت چکی ہوتی ہے کسان کی بیٹی اپنے گیت میں محبوب کو خط لکھنے کا خیال پیش کرتی ہے:

"اَدھی راتیں چڑھن کھتیاں،

[1] پروین یا ثریا ستارے۔

سجن وَل میں لکھاں چٹھیاں!
لکھاں سِدھیاں پوَن پُٹھیاں
خدا جانے کہ مرُٹھگیاں!!"

—— "آدھی رات کے وقت "کِھتّیاں" چڑھتی ہیں، اپنے محبُوب کو میں خط لکھتی ہوں! سیدھی بات لکھتی ہوں۔ (نتیجہ) اُلٹا ہوتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ میں مرکھپ چُکی ہوں!!"

یہ گیت بھی پنجاب کا ہے۔ گاؤں کی لڑکی ناخواندہ ہونے پر بھی محبوب کو خط لکھنے کا تصوّر اپنے گیت میں کرسکتی ہے۔ خط میں وہ کیا لکھتی ہوگی؛ "کِھتّیوں" کی تصویر میں اپنی محبّت سے ملتی جُلتی ایک چمک دیکھ لی ہے شاید اُس نے۔ اُسی کا پیغام وہ اپنے محبوب کو بھیج رہی ہوگی! ٹھیک ہے، محبّت کی مادری زبان "کِھتّیوں" کی خاموش زبان سے پرے تو نہ ہوگی! مگر اُس کی لکھی بات کا اُلٹا نتیجہ کیوں نکلتا ہے؟ پھر ایک دن، جب محبوب لوٹتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ تارے اسے سلام کررہے ہیں۔ پنجاب کے ایک دُوسرے گیت میں یہ تصویر موجود ہے:

"چاندی سجی تیری گھوڑی سجنا!
سیونے دی لگام!
جنھیں راہیں توں آیا سجنا!

•

تارے کرن سلام!"

—"چاندی سے آراستہ تیری گھوڑی ہے، او ساجن! سونے کی لگام ہے۔ جن راستوں سے ہو کر تو آیا ہے، او ساجن! (وہاں) ستاروں نے تجھے سلام کہا!"

ایک ایسا بھی ستارہ ہے جس کا راستہ آدمی بہ آسانی نہیں سمجھ سکتا۔ پنجاب میں اسے "بودی والا تارا" کہتے ہیں۔ ابھی امرتسر سے ایک دوست کا خط آیا ہے۔ اس میں مجھے "بودی والا تارہ" کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ لکھا ہے: دیر سے انتظار میں ہوں۔ آؤ تو اپنی نظمیں سناؤں۔ دنیا میں ایک دم تاریکی ہونے سے پیشتر ہی لوٹ آؤ تو بہتر ہو۔ تاریکی ہو گئی تو باتیں کرتے کرتے ہم ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھ پائیں گے۔ ارے بھئی! تم تو نرے 'بودی والا' تارا ہو۔ تمہارے راستہ کی خبر پانا آسان نہیں"۔ میں نے جواب میں لکھ بھیجا ہے: "میں خوش قسمت ہوں کہ تم مجھے 'تارا' سمجھتے ہو۔ صبر کرو۔ ایک دن میں چاندی سے آراستہ گھوڑی پر اس کی سونے کی لگام ہاتھ میں لئے امرتسر کی طرف لوٹوں گا۔ اور اگر راستہ میں کہیں 'بودی والا تارا' مجھے سلام کریگا تو میں اسے بھائی کہہ کر اس سے ایک بار بغلگیر ضرور ہوؤں گا۔"

۳

سنتھال لوگوں کے ہاں جو آجکل بہار میں سنتھال پرگنہ میں زیادہ تر

آباد ہیں، اور جو کسی زمانہ میں خانہ بدوش رہے ہیں، میں دو بار ہو آیا ہوں بھیلوں اور گونڈوں کے جنگل بھی میں نے خوش ہو کر دیکھے ہیں۔ کونڈہ اور ساورہ لوگوں کے پہاڑی علاقے، میں نے اچھی طرح چھان مارے ہیں۔ یہ اب صوبہ اڑیسہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اکثر وہاں کا پانی پینے سے باہر کے آدمی کو جھٹ بخار آ چمٹتا ہے، اور بخار بھی ایسا جو کئی بار دیرینہ ساتھی بن جاتا ہے اور آدمی کی جان لے کر ہی آرام پاتا ہے۔

جنگل کے لوگ قدرت کی گود میں بستے ہیں۔ پھول انہیں بہت بھاتے ہیں۔ سنتھال لوگوں کا ایک ہر دلعزیز گیت ہے:

"جنگل میں پھول بہت ہیں
اُن میں یہ ایک کپاس کا پھول بھی ہے
جو پھول پسند ہو چُن لو،
جو ناپسند ہو اُسے اسی کی جگہ پر چھوڑ دو۔"

سنتھال لوگوں کی قدیم زباں زد روایت بتاتی ہے کہ اپنے مقامِ پیدائش سے یہ لوگ طلوع ہوتے سورج کی طرف مُنہ کئے صدیوں تک سفر کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے کو سنتھال نہیں کہتے۔ "سم تھل" (رمید ان) میں آنے سے، پڑوسیوں نے انہیں یہ نام دیا۔ اُن کا اپنا قومی لقب ہے "ہوڑ" — یعنی "آدمی" یا "انسان"۔ اُن کا ایک قدیم گیت ہے:

"میرے بھائی بہت ہیں۔

اُن میں سے ایک کو وہ لوگ پکڑلے گئے
اتنے آدمیوں میں سے ایک کی کمی ہوگئی تو کیا ہُوا؟
پر ہائے! ایک کے چلے جانے سے ہم سب اُداس ہیں!"

کاکا کالیلکر صاحب نے اس گیت کی بہت تعریف کی ہے — "کتنا شیریں جذبہ ہے! کتنا بڑا غلبہ ہے محبت کا! اگر یہ جذبہ ہر جگہ موجود رہتا تو انسان کا بہت بھلا ہُوا ہوتا۔"

ایسے گیت میری خانہ بدوشی کو آسان بنائے رکھتے ہیں۔

میری جڑیں دیہاتی گیتوں کی دھرتی میں گہری چلی گئی ہیں۔ میرا شوق پختہ ہے اور اس شوق کی جڑیں زندہ ہیں اور مضبوط بھی۔ ہمیشہ سڑک مجھ سے کہتی ہے — "چلو! ابھی اور آگے چلو!"

۴

پچھلے آٹھ ماہ سے آندھرا دیش کا چکّر لگا رہا ہوں۔

بہت سے گیت جمع کر چکا ہوں۔ یہاں کے دو گیت تو نہایت دلچسپ ہیں۔ (۱) "اُرملا کی نیند" اور (۲) "لکشمن ہنس پڑا"۔ یہ گیت بہت لمبے ہیں یہاں کی عورتیں ہی اکثر انہیں گاتی ہیں۔ عورتیں خود اپنے گیتوں میں ان دونوں گیتوں کو ممتاز سمجھتی ہیں۔

"اُرملا کی نیند" میں رام چندر جی کے بھائی لکشمن کی بیوی کی چودہ سال

لمبی نیند فرض کی گئی ہے۔ رامائن میں اُرملا کا ذکر بہت کم آیا ہے۔ ٹیگور نے اپنے ایک مضمون میں بہت دن ہوئے، بالمیکی کو کوسا تھا کہ کیوں اُنھوں نے بےچاری اُرملا کی تصویر رامائن میں پوری طرح سے نہیں کھینچی۔ لکشمن نے رام اور سیتا کے ساتھ واپس ایودھیا میں لوٹ کر بھی اپنی بیوی اُرملا کی خبر تک نہ پوچھی تھی، رام کا دربار لگا ہے۔ سیتا شکایت لے کر حاضر ہوتی ہے "اُرملا چودہ سال سے پڑی سوتی ہے۔ اور لکشمن ہے کہ وہ اُسے پوچھنے تک نہیں گیا!" رام حیران رہ جاتے ہیں۔ یہاں سے ہی گیت شروع ہوتا ہے۔ پھر لکشمن اُرملا کو جا کر جگاتا ہے۔

دُوسرے گیت میں لکشمن ایک بار رام کے دربار میں ہنس پڑتا ہے۔ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ وہ اُسی کی کسی خامی پر ہنسا ہے۔ سیتا بھی جو رام کے پاس بیٹھی تھی یہی سمجھتی ہے کہ لکشمن یہ یاد کر کے کہ میں لنکا میں راون کی قید میں رہی تھی اور آج رام کے پاس بیٹھی ہوں بغیر ہتک پر بہت شرمندہ ہوئے۔ رام تلوار اُٹھا لیتے ہیں، لکشمن کو قتل کرنے کے ارادہ سے۔ سیتا ان کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ لکشمن بتلاتا ہے کہ وہ کسی کی کمزوری پر بالکل نہیں ہنسا۔ جنگل میں نیند کی دیوی اُسے پہلے ہی روز رات کے وقت ملنے آئی تو اس نے کہا تھا کہ آج تو تم جاؤ، چودہ سال نہ سونے کی قسم کھا لی ہے میں نے، تم میری بیوی کے پاس جا سکتی ہو۔ میرے پاس تو اُس وقت

آتا جب میں ایودھیا میں بن باس کے بعد رام کے پاس بیٹھوں اور چونکہ آج عین وقت پر نیند میری آنکھوں میں آحاضر ہوئی میں پرانی بات کو یاد کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ رام شرمندہ ہوتے ہیں۔ پھر ہم رام کو سوتے لکشمن کے پاؤں دباتے پاتے ہیں۔

کون جانے اِن گیتوں نے کب جنم لیا تھا۔

دیہاتی گیتوں میں لوگوں کے دھڑکتے دل اور عظیم الشان ہندوستان کی جذبات بھری آنکھیں دیکھ کر خانہ بدوشی کا یہ میرا شوق نشہ سے بدل گیا ہے

۵

شروع میں مجھے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ عمر اسی شوق کی نذر کر دوں گا دل کہتا ہے، ابھی بہت عمر باقی ہے۔ مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا دل اس راستہ سے اُکتانے کا نہیں۔

اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ میری بیوی اب سفر کی تکلیفوں کی عادی ہو گئی ہے، وہ میرا ساتھ چھوڑ دے تو میں آج ہی اپنی ناکامی تسلیم کر لوں۔

وہ کہہ رہی ہے۔ "میں خانہ بدوش کی بیوی ہوں۔ میں خوش ہوں"۔

اگر میں کبھی دیہاتی گیتوں پر چند کامیاب کتابیں لکھ سکوں گا تو اُن میں میری بیوی کی ایک خاموش تصویر تو رہے گی ہی۔

میری ڈاک بھی جگہ جگہ ہو کر گھومتی پھرتی مجھ تک پہنچتی ہے۔

ابھی اگلے دن میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر "ہمایوں" کا نوازش نامہ لاہور سے چل کر پورے دو ہفتہ بعد مجھے مِلا۔ لکھا ہے: "مجھے اُمید نہیں میرا یہ خط آپ کو مِل سکے۔ پھر بھی بھیج رہا ہوں کہ اگر مِل جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے کہ مَیں آپ کو بھُولا نہیں۔ نہ مَیں نہ ہمایوں۔"

دوستوں کی محبت مجھے زندہ رکھتی ہے "ہائے! ایک بھائی کے چلے جانے سے ہم اُداس ہیں" یہ جذبہ، معلوم ہوتا ہے، میرے ایک ایک دوست کے دل میں موجود ہے۔

مَیں نے زندگی میں کوئی دولت جمع نہیں کی، اُدھر میری نظر میں روپیہ ملے، نہ ملے، خانہ بدوش تو محبت کے زور سے کسی نامعلوم کشش سے آگے بڑھتا ہے۔

آزاد کھُلی ہوا میرے دِل میں بس گئی ہے۔

مَیں ہوا کے ساتھ اُڑتا ہوں، پھر کبھی کسی دوست کا خط آجاتا ہے، تو زندگی اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مَیں نے صرف دوست ہی کمائے ہیں۔

"پتا جی! ہم لنکا کب جائیں گے؟"

"چُپ بیٹی! ابھی پیسے تو آنے دو کہیں سے!"

"کہاں سے پیسے آئیں گے؟"

"خدا بھیجے گا!"

"ضرور!"

"ہاں ضرور!"

کویتا ہنس رہی ہے۔ اُس کی ماں بھی، اور میں بھی۔

نیجواڑہ
فروری ۱۹۴۰ء

۱۴

لنکا دیس ہے کولمبو

"یہ جگنو ہے، ماں! — دُور دیس کا راہی!" — بچپن میں جب میں پہلی بار جگنو پکڑ کر ماں کے پاس لایا تھا، تو ماں نے یہ بات بڑے فخر سے کہی تھی۔

جگنو میری مٹھی میں بند تھا اور انگلیوں کی درمیانی درزوں سے نکلتی ہوئی مدھم جوت بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ضرور کسی دُور دیس کا کیڑا ہے۔ اور رات ہوتے ہی کسی جادُو کے اثر سے اپنے ہمجولیوں سمیت اِدھر چلا آتا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے مَیں ہرن کے بچّے کی طرح آنگن میں کود

رہا تھا۔ اور ماں نے کہا تھا "اسے چھوڑ دے، بیٹا! دیکھنا اس کے پنکھ نہ توڑ دینا، اور پیچھے اس کی ماں بے چین نہ ہوتی رہے!"

میں نے جگنو کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی برسوں تک میں جگنوؤں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ ہاں، یہ ڈر ضرور لگا رہتا کہ کہیں میرا گھر اتنا پیچھے نہ رہ جائے کہ میں راستہ ہی بھول جاؤں۔

کولمبو میں پہنچ کر مجھے بچپن کے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے ہیں جگنوؤں کے پیچھے دوڑتا ہوا دور نکل جانے سے ڈرنے والا بچہ بڑا ہو کر اتنی دور سمندر پار آ پہنچے گا، یہ کون جانتا تھا؟ یہ تو ماں بھی نہ جانتی تھی۔

تاروں کی چھاؤں میں ہم تینوں سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں — میں، میری بیوی اور میری بیٹی کویتا۔ دور تک سڑک چلی گئی ہے، سمندر کے کنارے کنارے۔ غریب مزدور کے جمے ہوئے لہو کی طرح اس کا رنگ کالا ہے۔ اور سڑک کے کنارے یہ فٹ پاتھ جس پر پڑی ہوئی بنچ پر ہم بیٹھے ہیں، کائی ابھرا ہوا ہے — کسی غمزدہ عورت کی آنکھ کی طرح جو لگاتار رونے سے سوج گئی ہو۔

سمندر اپنی زبان میں نہ جانے کیا بول رہا ہے۔ ان گنت صدیوں سے وہ یوں ہی بول رہا ہے۔ دور سے ایک لہر آتی ہے، سر اٹھائے ہوئے، اور جب تک وہ کنارے سے آ کر ٹکرائے، زیادہ دور سے دوسری لہر اٹھتی ہے

جو پہلی لہر سے زیادہ زبردست ہوتی ہے اور سر اُٹھائے کنارے کی جانب چل پڑتی ہے۔ اور پھر اس سے بھی پرے، دونوں سے زبردست لہر سر اُٹھاتی ہے۔
سمندر کی اِن تینوں لہروں کے متعلق لنکا کے لوگ ایک کہانی سناتے ہیں۔ آج بھی یہ لہریں ایک ایک رُوح اپنے کندھوں پر اُٹھائے ناچ رہی ہیں۔ ایک نوجوان اپنی بہن کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر اُس کی اِتنی تعریف کرنے لگا کہ عورت کی زندگی گزارنے سے اُس کا من اوب گیا اور اُس نے شرما کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اُسے خودکشی کرتے دیکھ کر بھائی بھی اُس کے پیچھے کُود پڑا۔ اور پھر اُن کی ماں بھی اُن کے پیچھے ہولی۔
لوگ کہتے ہیں کہ سب سے بڑی لہر پر اُس لڑکی کی رُوح سوار ہے۔ اُس سے چھوٹی لہر پر لڑکے کی رُوح اور اُس سے بھی چھوٹی لہر پر ماں کی رُوح۔ صدیوں سے یہ رُوحیں بیقرار ہیں۔ مگر تینوں لہریں الگ الگ اُٹھتی ہیں اور کنارے سے الگ الگ ٹکراتی ہیں۔ آج تک یہ لہریں ایک دُوسرے کو منا نہیں سکیں۔
اور کولمبو کے اس وسیع سمندر کو دیکھتے ہوئے مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے:
ایک پہاڑی نالا سوچنے لگا کہ اُسے کسی چھوٹی سی برساتی ندی سے نہیں بلکہ خود سمندر کی بیٹی سے شادی کرنی چاہیئے۔ وہ گھر سے چل پڑا۔

راستہ میں ایک ندی ملی۔ وہ بولا" تم کہاں جا رہی ہو؟"
"میں اس جانب پچاس کوس کی دوری تک جا رہی ہوں"
"تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں سمندر کی بیٹی سے شادی کرنے جا رہا ہوں"۔
"چلو کچھ دُور ہمارا ساتھ ہے۔ راستہ مزے سے کٹے گا۔ آگے چل کر میں تمہیں کسی اور بہن کے حوالے کر دوں گی"
چلتا چلتا آخر وہ سمندر کے پاس جا پہنچا۔ اور اُسے مخاطب کر کے بولا" میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنے آیا ہوں"
"مگر اب تو چوماسے کے دن ہیں۔ اِن دنوں ہمارے یہاں شادی کی بات چیت نہیں ہو سکتی۔ اب جاؤ۔ پھر آنا۔ پھر میں اپنی بیٹی سے بھی مشورہ کر لوں گا"
نالا چلا گیا۔ کیسے؟ کون جانے؟ اور چوماسے کے بعد اُس میں اتنا پانی ہی نہ رہا کہ وہ سمندر کے پاس پہنچ سکتا۔ اور وہ سمندر کی بیٹی کو صرف سپنوں ہی میں دیکھتا رہ گیا۔
یہ کہانی میں نے المورڑے کے ایک پہاڑی کسان کے منہ سے سُنی تھی۔ سمندر کی بیٹی کی صورت کیا سچ مچ پہاڑی دیہات کی کسی سیتا خوبانی اور چنبیلی سے بھی زیادہ موہنی تھی؟ ہوا کرے۔ میں تو آدمی ہوں، کوئی

پہاڑی نالا نہیں۔ مجھے جو بیوی نصیب ہوئی ہے اور اب میرے ساتھ بنچ پر بیٹھی ہے، میرے لیے سمندر کی بیٹی سے کہیں زیادہ حسین ہے۔

"سمندر کی لہریں کیا بول رہی ہیں، پتاجی؟"

"وہ کہہ رہی ہیں کہ کویتا اُن کے ساتھ کھیلے۔ جاؤ کھیلو، بیٹی!"

کویتا چل پڑی ہے۔ فُٹ پاتھ سے نیچے اُتر رہی ہے۔ لو وہ ریتیلے ساحل پر چلی گئی۔ وہ دوڑ رہی ہے، عجب انداز سے، جیسے وہ کتھا کلی ناچ کی مشق کر رہی ہو۔

مگر وہ تو لوٹ رہی ہے۔ جب وہ سمندر کی لہروں سے مل جائے گی تب شاید وہ ہمارے اصرار کرنے پر بھی گھر جانے کا نام نہ لیا کرے۔

کویتا پھر ہمارے ساتھ بنچ پر آ بیٹھی ہے۔ چمکیلی آنکھوں سے کبھی میری بیوی سمندر کی طرف دیکھتی ہے اور کبھی کویتا کی طرف۔

"کویتا ہمارے سمندر کی لہر ہے۔"

"ہاں!"

اور میرے مُنہ سے یہ ایک ہی لفظ سُن کر میری بیوی کے گالوں پر وہی لالی دوڑ رہی ہے جو میں نے بارہ سال پہلے دیکھی تھی جب وہ دُلہن بنی قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس میں اپنی نچیلی آنکھوں کو دیکھتی تھی اور کبھی کنکھیوں سے میری طرف۔

پُرانے قصّوں میں کشیر ساگر[1] کی تعریف کے پُل باندھے گئے ہیں۔ مگر کیا وہ سمندر اس سمندر سے بھی خوبصورت ہے، جیسے لنکا کی پُرانی تاریخ یاد ہے اور جیسے کولمبو کا بچپن تو ہرگز نہ بھولا ہوگا۔ کشیر ساگر میں شیش ناگ نے وشنو بھگوان کے لئے ملائم سیج بنا رکھی ہے۔ وشنو جی لیٹ رہے ہیں لکشمی اُن کی بیوی اُن کے پاؤں دبا رہی ہے۔

خُوب تصوّر ہے۔ ہُوا کرے۔ یہ سب دیوتاؤں کی کہانی ہے۔

میں تو آدمی ہوں اور کولمبو میں سمندر کے کنارے اپنی بیوی اور بیٹی سمیت بنچ پر بیٹھا ہوں۔

۲

جب سے میں کولمبو میں آیا ہوں میری غریبی مجھ پر اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ جس مکان میں میں رہتا ہوں اُس کے قریب ہی ایک بیکری ہے۔ بیکری کا مالک کون جانے میرے متعلق کیا سوچتا رہتا ہے۔

"یہاں نوکری کی تلاش میں آئے ہو بھائی؟" چند روز پہلے اُس نے سوال کیا تھا۔

اور جب میں نے بتایا کہ میں یہاں لنکا کے دیہاتی گیت جمع کرنے آیا ہوں تو وہ حیران رہ گیا۔

[1] دودھ کا سمندر

وہ خود لنکا کا آدمی ہے — پکا بودھ۔ سنہالی جو اُس کی مادری زبان ہے وہ بڑی روانی کے ساتھ بولتا ہے۔ مگر سنہالی زبان کے دیہاتی گیت اُس نے کبھی نہیں سُنے اور نہ اُن کی اہمیت ہی کبھی اُس پر واضح ہوئی ہے۔

شاید وہ مجھے دیوانہ سمجھتا ہے۔ دیہاتی گیت ہی جمع کرنے تھے تو میں اپنی بیوی اور بیٹی کو ساتھ لئے کیوں مارا مارا پھرتا ہوں! اور پھر میں نے کولمبو میں ہی کیوں رہائش اختیار کی، کسی گاؤں میں جانا چاہئے تھا۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاؤں کہ شروع میں کولمبو میں رہنا ضروری ہے تاکہ یہاں کے ادیبوں کی مدد سے ایسے لوگوں کے پتے مل جائیں جو میرا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

غریبی خانہ بدوش ادیب کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ خُفیہ پولیس کی طرح وہ اُس کا استقبال کرنے کے لئے جگہ جگہ کھڑی رہتی ہے۔

اس بکری کو دیکھتا ہوں تو مجھے سارا کولمبو شہر ایک بڑی بھٹی معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس بھٹی میں میں ڈبل روٹی کی طرح سینکا جاؤں گا۔ یہ نگوڑی قسمت بھی تو ایک نانبائی ہی ہے۔ صدیوں سے وہ روٹیاں سینکتی آئی ہے۔ کتنا منجھا ہوا ہے اس کا ہاتھ۔ اور گندھے ہوئے آٹے کے گولے بناتی، انہیں تھپّوں سے گزارتی، اور انہیں سینکتی، وہ کبھی اُکتاتی نہیں۔

"یہی لنکا دیس ہے، پتا جی؟"

"ہاں، کویتا۔"

کل یہی سوال اس نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ اور اُسے یہی جواب ملا تھا۔

"راون کی لنکا کہیں ہے، پتاجی؟"

"ہاں، کویتا!"

وہ خاموش ہو گئی ہے۔ کون جانے کل وہ پھر یہی سوال دُہرائے۔ بچپن میں ہم کیوں ایک ہی سوال بار بار اُٹھایا کرتے ہیں؟ ایک بار جواب پا کر تھوڑی دیر کے لئے خود تسلی ہو ہی جاتی ہے مگر سوال برابر قائم رہتا ہے

کہاں ہے راون؟ کہاں ہے اس کی لنکا کا سونا؟ ہنومان نے راون کا محل جلا ڈالا تھا مگر اتنا سونا کہاں چلا گیا؟ ہاں تو کیا رامائن کا راون صرف شاعر بالمیکی کے سپنوں سے پیدا ہوا تھا؟ اور کیا شاعر کے سپنوں کا دھرتی کے ساتھ، دھرتی کی زندگی کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا؟

یہ کسی شاعر کے سپنوں کی لنکا کا حال نہیں ہے۔

اِدھر زندگی کا معیار ہندوستان کی اوسط درجے کی زندگی سے اُونچا ہے

اُس کی تکلیف جتنی غریب خانہ بدوش ادیب محسوس کرتا ہے اُتنی خاص لنکا والوں کو نہیں ہوتی۔ اُن کو زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے تو وہ زیادہ کماتے بھی تو ہیں۔

شنٹ کرتے ہوئے انجنوں کی طرح خوش پوش جنٹلمین ہر چہرے کو گھورتے

ہوئے نکل جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے شام کے وقت آپ بھی آ جائیں اور فیشن کا ناٹک دیکھ لیں۔

کل ہی مسٹر سکلوا کی بیوی اُن سے جاپانی جارجٹ کی ساڑھی کے لئے روپے مانگ رہی تھی۔ مجھے اپنے ایک بنگالی دوست کی تنگدستی یاد آ گئی۔ بہت افسوسناک صورت بنا کر مسٹر نگر جی نے مجھے بتایا تھا کہ اُن کی بیوی نیا مہینہ چڑھتے ہی کہنے لگتی ہے کہ ابھی روز اُس کے لئے نئی ساڑھی آ جانی چاہئے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ مسز نگر جی ڈھاکہ کی اصلی ریشمی ساڑھی مانگتی ہے اور مسز سکلوا بدیسی کپڑے کے سستے پن پر فدا ہے۔

کولمبو میں ہندوستانیوں کی بہت سی دُکانیں ہیں۔ نئی سنوری عورتیں اپنی ضرورت کی چیزیں خود خریدنے آتی ہیں۔ ہر دُکان پر کالی کالی آنکھوں اور چمکیلے ریشمی بالوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ ساڑھی کا مول پوچھنے والی نازنین کی دھیمی، شیریں آواز سن کر سادی وضع کا ہندوستانی کارندہ اپنے دل میں ایک گدگدی سی ضرور محسوس کرتا ہوگا مگر اُسے یہ سوچنے کی فرصت کہاں کہ وہ لڑکی ابھی "مس" ہے یا "مسز" بن چکی ہے۔ یہاں بہو اور بیٹی کی پوشاک میں وہ ذرا فرق نہیں دیکھتا۔ اِدھر دُلہنیں اپنی مانگ میں سیندور تک نہیں لگاتیں۔

"لنکا دلیس عجیب ہے جی! اِدھر سہاگن اور بیوہ کی بھی کوئی پہچان نہیں۔"

"سچ ہے"

"ہے تو آخر راون کی لنکا نا!"

بساطی کی دُکان سے یہ آواز آرہی ہے۔ مَیں سُن رہا ہوں..... ٹریم چل رہی ہے۔ موٹر کاریں اِدھراُدھر گھوم رہی ہیں..... اور پھر بھی یہ راون ہی کی لنکا رہی!

اب مَیں اتنا غریب نہیں۔ کولمبو کے اخبارات سے مجھے اپنے مضامین کا معاوضہ ملنے لگا ہے۔ کچھ روپیہ مدراس سے بھی آرہا ہے۔ اب مکان والے کا کارندہ ہمارے یہاں کرایہ لینے آتا ہے تو مجھے اپنے آپ پر غصّہ نہیں آتا۔

اس مکان میں بجلی کا بھی عجب انتظام ہے۔ ایک مخصوص خانے میں پچیس سینٹ (چوّنی) کا سکّہ ڈالنا پڑتا ہے۔ میٹر سے یہ پتہ چلتا رہتا ہے کہ بجلی کتنی باقی ہے۔ پہلے تو یہ حال تھا کہ یکایک اندھیرا ہوجاتا۔ اور جب کہیں میں چوّنی ڈالتا تو روشنی ہوتی۔ اور اب یہ حال ہے کہ مَیں چاہوں تو ایک وقت میں تین چار سکّے ڈال سکتا ہوں۔

۳

کیا لنکا کی تاریخ میں کوئی راجہ ایسا نہیں گزرا جسے اپنی پٹ رانی سے وہی محبّت رہی ہو جو شاہجہاں کو اپنی ملکہ سے تھی؟ کاش! یہاں بھی کسی راجہ نے کوئی مقبرہ بنوایا ہوتا۔ اُسے اپنی بیوی کو دکھانے

ہوئے مَیں وہی الفاظ دُہراتا، جو آگرہ میں میری زبان سے نکل پڑے تھے۔ "یہ صرف شاہجہاں کا ہدیہ نہیں۔ یہ مرد کا ہدیہ ہے عورت کی خدمت میں!" اس وقت مجھے اپنی غریبی بھُول گئی تھی۔ مَیں بھی ایک شاہجہان تھا، اور میری بیوی ایک ممتاز محل!

سُورج نکلنے سے پیشتر سمندر کے کنارے کھڑا ہونا بڑی خوش قسمتی ہے۔ پہلے اُشا کے گالوں پر وہ لالی نظر آتی ہے جو پہلی بار دولھا کے سامنے آنے پر شرمیلی دُلھن کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے اور پھر یہ لالی دھیرے دھیرے غائب ہوجاتی ہے۔

خود مَیں نے ہی للچائی ہوئی نظروں سے ہزار بار سُورج بھگوان کو اپنے سونے کے رتھ پر سوار ہوتے دیکھا ہے۔ اور ہر بار مجھے یہ رتھ نیا ہی معلوم ہُوا۔ مگر کولمبو کے ساحل پر یہ رتھ اَور بھی نیا اور چمکیلا معلوم ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں "راون کی لنکا کا سارا سونا کہیں سُورج بھگوان کے رتھ پر تو نہیں خرچ ہوگیا۔"

اَور میری بیوی کہتی ہے "اجی واہ! یہ رتھ تو پُرانا ہے، سینکڑوں راونوں سے پہلے کا ہے!"

کل شام شاعر ٹیگور کا ایک خیال مجھے بہت گدگدا رہا تھا:

"شام کے دھندلکے میں سب چیزیں بھُوت پریت بن جاتی ہیں۔

میناروں کے پیچھے چھپے اندھیرے میں کھو گئے ہیں۔۔۔ میں اُشا کی راہ دیکھوں گا اور جاگ کر تیرے شہر کا درشن کروں گا!“

— اب صبح کی روشنی میں سوچتا ہوں کہ کہیں شاعر نے یہ نغمہ کولمبو میں بیٹھ کر تو نہ لکھا تھا۔

شاعر کبھی آسمان کو دیکھتا ہے اور کبھی بے کنار سمندر کی طرف، جس کے آئینے میں سورج ہمیشہ سے اپنا مُنہ دیکھتا آیا ہے۔

”تیری زبان کیا ہے، او سمندر؟“

”ابدی سوال کی زبان!“

”تیرا جواب کونسی زبان ہے، او آسمان؟“

”ابدی خاموشی کی زبان!“ (ٹیگور)

سمندر کی لہریں ناچ رہی ہیں، جنوبی ہند کی دیو داسیوں کی طرح۔ اِن لہروں کو کس دیوتا کی پُوجا کا شوق ہے؟ اس ساحل پر شیو کی مُورتی تو دکھائی نہیں دیتی۔

۴

رامائن میں لکھا ہے کہ راون شیو کی پُوجا کیا کرتا تھا۔

اور بُدھ کی لنکا میں بھی شیو کا بیٹا کندے سوامی — جسے ہندو پُرانوں میں کارتیکے کہا گیا ہے — عام لوگوں کے دلوں پر برابر

راج کر رہا ہے۔

کندے سوامی کے معنی ہیں "پہاڑ کا مالک"۔ پہلے یہ دیوتا تین چوٹیوں والے پہاڑ پر رہتا تھا۔ ایک دن وہ نیچے دریا کے اُس پار جانے کے لئے، جہاں درختوں کا جھُرمٹ نظر آرہا تھا، بیقرار ہو گیا۔ تب وہ صرف تامل لوگوں کا دیوتا تھا۔

ایک دن اُدھر سے کچھ تامل گزرے، اور دیوتا بولا "اے اچھے لوگو! مجھے دریا کے اُس پار لے چلو۔"

"مگر ہم نمک جمع کرنے جا رہے ہیں، او اچھے دیوتا! دیر ہو گئی تو بارش آجائے گی! اور سارا نمک گھُل جائے گا۔"

وُہ چلتے بنے۔ اور دیوتا ناراض ہو گیا۔

پھر اُدھر سے کچھ سنہالی گزرے، تو دیوتا نے اپنی خواہش دُہرائی۔ وُہ اُسے نیچے لے گئے۔ اور دیوتا خوش ہو گیا۔

کندے سوامی نے یہ بردان دیا کہ آئندہ صرف سنہالی نسل میں سے ہی اس کا بڑا پجاری چُنا جائے گا۔ آج تک یہ بردان اٹل ہے۔ اس دیوتا کے بڑے مندر میں جو لنکا کے جنوب مشرقی حصے میں کترگام میں واقع ہے سنہالی پجاری چلا آتا ہے۔

کولمبو میں بھی، جہاں مختلف نسلوں کے تین لاکھ آدمی بستے ہیں،

کندے سوامی کے بھگت مِل جائیں گے۔ تامل لوگ اُسے "سُبرمینیم" کہتے ہیں
جب دھرتی پر دیوتاؤں اور اسروں میں یُدھ ہوا تھا، دیوتاؤں کی فوج
کو اسی نے لڑائی کے گُر سمجھائے تھے۔ وہ مور کی سواری کرتا ہے، اور
جنگ کا دیوتا ہے!

کل ٹریم میں ایک بودھ بھکشو سے ملاقات ہوگئی۔ پتہ چلا کہ وہ گوشت
نہیں کھاتا۔ اور میں نے محسُوس کیا کہ خود بُدھ بھگوان میرے سامنے
بیٹھے ہیں۔

"اہنسا کے قائل اور اس پر بھی گوشت خور!" مَیں نے کہا "آپ
لنکا والوں کو سمجھاتے کیوں نہیں؟"

وہ صرف مُسکرایا۔ اور میں نے سوچا کہ خود بُدھ بھگوان بھی اسی طرح
مُسکراتے ہوں گے، اور پاس کی نشست سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بول
اُٹھا۔ "ہم بازار سے گوشت خریدتے ہیں، خود کسی جاندار کو نہیں
مارتے اور کھانے کو تو ہم کسی بھی طرح کے گوشت سے پرہیز نہیں کرتے۔"
بودھ بھکشو کو مَیں نے نمسکار کیا۔ وہ پھر مُسکرایا۔ اور وہ ادھیڑ عمر
کا آدمی ہنس رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ اُس نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔
ٹریم سے اُتر کر میں جے، وجے تُنگ کے یہاں جا پہنچا۔ وہ بولے

"آیئے، آیئے۔"

اپنے گھر کے سامنے وُہ گھاس پر ٹہل رہے تھے ـــ ننگے پاؤں۔ اپنی کتاب کا نام رکھتے وقت بھی وُہ اسے بھُولے نہیں ـــ خوبصورت نام ہے "میرے قدموں کے لئے گھاس"۔

مَیں نے کہا "اپنے گاؤں کے لوگوں کو آپ نے چھوٹی ندی پر مچھلی پکڑتے دکھایا ہے۔ آپ کی کتاب میں یہ بات پڑھتے وقت مَیں حیران رہ گیا۔"

وہ ہنسنے لگے اور جھینپ سے گئے۔

"اور آپ نے اِسے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔"

"اجی مَیں نے کچھ جھُوٹ نہیں لکھا۔ سب سچ سچ لکھا ہے۔ ایک ہمارے ہی گاؤں میں نہیں، دوسرے دیہات میں بھی عورتیں رات کا بچا کھُچا بھات ندی میں لا گراتی ہیں۔ مچھلیاں اُسے کھانے کے لئے لپکتی ہیں۔ ایکا ایکی کوئی عورت ایسی چالاکی سے اُلٹی ہانڈی مچھلیوں کے اُوپر پھینک کر باہر نکالتی ہے کہ اُس میں چند مچھلیاں رسوئی کی ضرورت پُوری کرنے کے لئے آپھنستی ہیں!"

"تو آپ اسے ٹھیک سمجھتے ہیں؟"

"اب یہ مَیں کیسے کہوں؟" وہ کچھ جھینپ سے گئے۔

اپنی کتاب میں انہوں نے لکھا ہے "مچھلی پکڑنے کا یہ طریقہ ایک طرح سے دوستی اور اہنسا کے اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ مچھلیاں جو روز رات کا بچا بھات کھاتی ہیں، باری باری سے آدمی کی رسوئی کے لئے پکڑ لی جائیں تو کوئی پاپ تھوڑا ہی ہے۔"

مذہب کے ساتھ آدمی کا یہ مذاق بہت پُرانا ہے۔

۵

اُس کی آواز بنسری کے سُروں سے مل رہی ہے۔ یہ گاڑیبان گاؤں کا آدمی ہے۔ کولمبو کی سڑک پر پہنچ کر بھی اُس نے اپنے گاؤں کو بھلا نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ کسی سپنے سے ابھی جاگا ہے۔

وہ گا رہا ہے:

"تاریکی میں جگنو اُڑ رہے تھے۔
اُن کے پروں سے ٹمٹماتی روشنی آ رہی تھی۔
اور کسی کی معصوم سی میٹھی آواز میرے کان تک پہنچی!
اجی تم اُس کے دھیان میں اتنا کیا سوچنے لگے ہو؟"

صرف گاؤں کی کسی کنواری کی آواز ہی گاڑیبان کے کان تک پہنچی، اور اُسے گھائل کر گئی۔ پیار صرف رُوپ دیکھ کر ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اپنے گیتوں میں گاڑیبان اپنے بیلوں کو بھی نہیں بھولتا:

"دوسروں کا پیٹ پالنے کی خاطر تم خود دُکھ اُٹھاتے ہو۔
دن رات کام کرتے ہو، مار سہتے ہو!
درد کی ٹیسیں برداشت کرتے ہو۔
ارے او بیل! کتنے ہی آدمی تو تجھ سے بھی کم وقعت رکھتے ہیں!"

مگر کولمبو شہر کی فضا میں دیہاتی سنگیت کی آواز بہت اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ لاریوں کے ڈرائیور چھکڑے کو دیکھتے ہیں تو ہنس دیتے ہیں۔ گاڑیبان لاری کا ہارن سنتا ہے تو سہم جاتا ہے۔ وہ بھی اور اُس کے ساتھی بھی۔

سنہالی گیتوں کے سُر میری زبان پر چڑھ رہے ہیں۔ برسات میں بھیگے کھیتوں کی سوندھی سوندھی مہک پھیل جاتی ہے اسی طرح ہر ملک کے سنگیت کی تانیں ہم تک پہنچتی ہیں اور ہمیں اپنا دلدادہ بنا لیتی ہیں۔
کچھ دیہاتی گیت تو مجھے کولمبو میں ہی چند ادیبوں سے مل گئے ہیں۔ آب ں لنکا کے مختلف حصوں میں پہنچوں گا۔

اور جب مجھے لنکا کو الوداع کہہ کر ہندوستان لوٹنا پڑے گا تو میں ٹیگور کے ب نغمے میں "دُنیا" کے بجائے "لنکا" بدل کر پکار اُٹھوں گا:

"اے میرے لنکا! میں تیرے ساحل پر اجنبی کی طرح آیا۔
میں تیرے گھر میں مہمان بن کر رہا۔

اور اب مَیں تیرے دروازے سے
دوست بن کر رُخصت ہوتا ہوں۔"

"یہ راون کی لنکا ہے یا بُدھ بھگوان کی؟"
"دونوں کی، کویتا!"
"سچ مچ؟"
"سچ مچ!..... اور اس سے بھی سچ تو یہ ہے کہ لنکا تمہاری بھی ہے، تمہاری ماتا کی بھی، اور میری بھی!"
ہم تینوں خوش ہیں ــــ میں، میری بیوی اور میری بیٹی کویتا۔
سامنے بے کنار سمندر اپنے ابدی رقص میں محو ہے۔ یہ سڑک جو کنارے کنارے چلی گئی ہے اور جس کا رنگ غریب مزدور کے جمے ہوئے لہُو کی طرح کالا ہے، کولمبو کے تین لاکھ باشندوں ہی کی نہیں، ہماری خوشی کی بھی امانت دار ہے۔ سڑک ہی نہیں، یہ فُٹ پاتھ بھی، جو بدستور اُبھرا ہُوا ہے ــــ غمزدہ عورت کی آنکھ کی طرح جو لگاتار رونے سے سُوج گئی ہو۔

کولمبو
مئی ۱۹۴۰ء

۱۵

جنگلی کبوتر

ماں کی گود کی طرح یہ گاؤں بار بار مجھے بُلاتا ہے۔ آدمی کی طرح گاؤں کی جنم پتری بنانے کا رواج ہوتا تو نہ صرف میں اس کی وجہ تسمیہ دریافت کر سکتا، بلکہ اس کی عمر کا بھی ٹھیک ٹھیک پتہ چلا لیتا۔ نام ہے بھدوڑ۔ اور یہ لفظ میرے لئے ایک گُتھی سے کم نہیں۔ ہاں جہاں تک اس کی عمر کا تعلق ہے، یہ گاؤں، جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے، ہماری ریاست کی راجدھانی پٹیالہ سے بھی کہیں پہلے آباد ہُوا تھا۔

چاروں طرف کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ اِن میں سے بس تھوڑے سے گاؤں ہی اب تک دیکھ پایا ہوں۔ باقی گاؤں دیکھنے کا ارادہ ضرور ہے۔ کون جانے کب ایسا کر سکوں۔ راس کماری تک چکّر لگا آیا۔ اِس سے بھی پرے لنکا میں بھی گھوم پھر آیا۔ مگر یہیں کے یہ گاؤں میری نگاہ سے پرے رہے!

یہاں میں نے جنم لیا۔ میرے سپنوں میں جو درجہ اسے حاصل ہے وہ کسی دوسرے کا حق نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ گاؤں ہمیشہ کے لئے مجھے جکڑ نہیں سکتا۔

ماں کہتی ہے "دیو! تم آتے بعد میں ہو اور جانے کی رٹ پہلے ہی لگانے لگتے ہو!" بیوی کہتی ہے "اب تو میں چند ماہ یہاں اپنی ساس کی خدمت کروں گی!" "ضرور!" میں جواب دیتا ہوں اور میری بیوی کا سارا حسن اُس کی کالی مدھ ماتی آنکھوں میں ناچ اُٹھتا ہے۔ مگر اندر سے وہ خوب جانتی ہے کہ نہ جانے یکایک کس دن اُسے میرے ہمراہ کسی نئے سفر پر چلنا پڑے۔

اُس آزاد پنچھی کی طرح جو آسمان کی وسعتوں کا دورہ کرنے کے بعد پھر دھرتی پر اُترتا ہے، میں بار بار یہاں چلا آتا ہوں۔ کسی مقناطیسی کشش کے زیرِ اثر۔ زندگی کے شروع کے تیرہ سال اسی گاؤں میں گزرے

تھے ۔ میں اس کی نبض پہچانتا ہوں ۔ کتنی ہی دُور کیوں نہ نکل جاؤں، اس کا تصور میرے دماغ میں برابر بندھا رہتا ہے ۔

دُور دُور جدھر بھی نگاہ اُٹھتی ہے ۔ کھیت لہلہا رہے ہیں ۔ ساری دھرتی مجھے جانتی ہے، جیسے میری اپنی ماں جس کی گود میں میں پلا ہوں، میری رگ رگ سے واقف ہے ۔ اس ماحول میں ماضی اور مستقبل گھُل مل کر حال میں بدل جاتے ہیں ۔

پُرانی کہانیاں یہاں اب بھی شوق سے سُنی جاتی ہیں ۔ گیتوں کو بھی وہی پہلا دخل حاصل ہے ۔ یہ کہانیاں اِن لوگوں سے چھین لی جائیں، یا یہ گیت کسی طرح ان کے پاس نہ رہیں، تو اِن کی زندگی پر کیسی مُردنی چھا جائے ۔

غُربت بھی ہے، اور افسردگی بھی ۔ مگر دل کو خوش کرنے والے پُرانے افسانے اَور گیت بھی تو ہیں ـــــ تھکن اُتار دینے والے، ڈانواں ڈول روحوں کو خُود فراموشی کے عالم میں لے جانے والے ۔ یہ افسانے اور گیت ماضی کے بیٹے ہیں، اور مستقبل کے امانت دار ۔

سُنے جاؤ، اَور سنائے جاؤ اپنے افسانے، دھرتی کے بیٹو، اُور گائے جاؤ اپنے گیت پُرانے اَور نئے ۔

وُہ سُرخ و سفید گول مہتابی چہرہ۔ وہ میرے دادا کا جھرّیوں والا چہرہ اب کہاں! ایک صدی کے لگ بھگ اُن کی عُمر اِسی گاؤں میں کٹ گئی۔ پُرانی روایتوں کی تو وہ گویا ایک کان تھے " دھرتی ہم سب کی ماں ہے۔ اِسے صرف سطحی انداز سے ہی نہ دیکھتے رہنا۔ اس کے دل کی دھڑکن سُننا اور جو یہ کہے اُسے ماننا!"— اُن کی یہ نصیحت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔

چاند اب بھی چمکتا ہے اور کھیت اپنے سینے کھولے پڑے رہتے ہیں۔ امرت بھری کرنوں کو دھیرے دھیرے اپنے اندر جذب کیئے جاتے ہیں! دھرتی کے بیٹے یہ لظارہ دیکھتے ہیں، تو وہ زندگی کا سب درد اور کرب یک لخت بھُول جاتے ہیں۔ چاندنی میں ایک مدھ ماتی کیفیت ہوتی ہے۔ کھیت تو کھیت، بیابان اور ریتیلے میدان بھی چاندنی میں اپنے اندر کی طرف دیکھنے لگتے ہیں، جیسے ایک بڑھیا، جو بظاہر عمر رسیدہ گائے کی طرح دُودھ نہ دے سکنے کی وجہ سے بے کار ہوگئی ہو۔ اپنے بیٹے کی بہُو کا چاند سا مُکھڑا دیکھ کر اپنی جوانی کی یاد میں کھو جاتی ہے۔

بہار اب بھی آتی ہے اور بہار کا وُہ پُرانا نغمہ، جو صدیوں سے دلوں کی سیر کرتا ہم تک پہنچا ہے، اپنے الفاظ میں آج بھی وہی

جادو لئے ہوئے ہے:

"کدے بول وے نمانیاں کاواں!
کوئلاں کوک دیاں"

— ارے او حقیر کوّے! کبھی تو بھی بول۔ کوئلیں تو کوک رہی ہیں۔
کوئل کی نرالی، نازک اور رسیلی کوک کہہ رہی ہے۔ بہار آگئی! جس کا محبوب پردیس میں ہے وہ بہار کا استقبال کیسے کرے!؟ مگر کوئل کیا جانے برہن کا درد! اس کی کوک مسلسل ہے۔ برہن حقیر کوّے سے اُس کی کائیں کائیں کا مطالبہ کرتی ہے۔ صدیوں سے کوّا بولتا آیا ہے اور آج بھی جب وہ منڈیر پر بیٹھ کر اپنی کائیں کائیں شروع کرتا ہے، گاؤں کی عورت کہہ اٹھتی ہے "آج کوئی مہمان آئے گا" اور کون جانے یہ مہمان برہن کا ساجن ہی ہو۔ اور کوئل کے متعلق عورتوں کا خیال ہے کہ وہ خود ایک برہن ہے اور ہجر کی آگ میں جل کر ہی وہ کالی ہو گئی ہے۔

پرندے یقیناً آدمی سے بہت پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ پہلے پہل پرندوں کے میٹھے بول سن کر آدمی کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی ہوگی۔ کچھ پرندے تو اس کے جگری دوست بن گئے۔ سوچتا ہوں کوئل کی کوک میں کیا پہلے روز بھی ایسا ہی درد و گداز تھا؟ اور کیا کوّے کی کرخت کائیں

کائنات میں پہلے روز بھی کوئی سٹھاس نہ تھی ؛ مگر ہائے! کتنے ہی پرندوں کو تو آدمی نے اپنی خوراک میں شامل کر لیا۔

بچپن سے ہی کبوتر کے لئے میرے دل میں ایک خاص کشش رہی ہے۔ ہمارے گھر کے عین سامنے ایک کبوتر باز رہتا ہے۔ ذات کا بیراگی اور کام کبوتر بازی۔ اُس کا یہ شوق اب بھی قائم ہے۔ لیکن اب شاید اُس کے پاس زیادہ پیسے نہیں آتے، ورنہ آج بھی اس کے یہاں کبوتروں کی اُتنی ہی تعداد ہوتی جتنی میں اپنے بچپن میں ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔

ابھی تک یہ کبوتر باز کنوارا ہی ہے اور اب کون بیراگی اُسے اپنی لڑکی دے گا؟ یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اُس کی بیوی ہمیشہ جان کو رویا کرتی۔

اب تو خیر مجھے یہ کبوتر باز زیادہ نہیں بھاتا، پر بچپن کے دن میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ گھر والوں کی آنکھ بچا کر اُس کی چھت پر میں مٹھیاں بھر بھر کے باجرہ پھینکتا رہتا تاکہ مُفلس بیراگی کے کبوتر بھوک سے نہ تڑپا کریں۔ جب وہ اُڑتے کبوتروں کو للکارتا اور پھر اُنہیں واپس بُلانے کے لئے ہاؤ ہاؤ کرتا، میں سوچتا، کاش میں بھی ایک کبوتر ہوتا۔ "پٹھا ہے تو اچھا"—— اُس کی آواز میں وہ تعریف ٹپکتی تھی، جو مدرسے کا اُستاد بھی اپنے ہوشیار شاگرد کے کانوں میں نہیں پڑنے دیتا۔ اور کبوتر بھی اُس کی آواز پر ناچتا نظر آتا۔

میرا تخیل اُوپر آسمان کی طرف اُڑتا، کبوتروں کے ساتھ ساتھ، دُور بہت دُور۔ کبوتر بادلوں کو چھوتے دکھائی دیتے۔ گھر کا تصور ان کے دلوں میں برابر بندھا رہتا، اُن کے مالک کا بشاش چہرہ اُن کی آنکھوں میں پھرتا رہتا اور وہ سب کے سب اُس عشق بازی کی وہ گھڑیاں یاد کیا کرتے جو کہ مالک کا دل خوش کرنے کے بعد، آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں کی سیر کرنے کے بعد انہیں نصیب ہوتیں۔

اس کبوتر باز بیراگی کا نام ہے رانجھا۔ آپ اس نام کی دلکشی سے بالکل انکار نہیں کر سکتے۔ فرق اِتنا ہی ہے کہ ہماری کہانی کا رانجھا بھینسیں چرایا کرتا تھا اور وہ بھی چندر مکھی "ہیر" کی، جسے وہ اپنی محبوبہ بنا چکا تھا۔ اور ہمارا یہ پڑوسی کبوتر اُڑایا کرتا ہے ــــ وہ بھی اپنے، اور اُسے کسی ہیر سے بیاہ کرنے کا بالکل شوق نہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ ہیر کے محبوب رانجھے نے بارہ سال تک اُس کی بھینسیں چرائی تھیں۔ اِس پر بھی ہیر کی شادی رانجھے سے نہ ہو پائی تو رانجھے کی خوشی اُداسی بن گئی۔ اور ہمارا یہ پڑوسی رانجھا پورے پچیس سال سے کبوتر پال رہا ہے۔ آج وہ اپنی کبوتر بازی کی "سلور جوبلی" منا سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ خوش رہا ہے۔

اِس رانجھے کی ماں نے اپنی ایک پڑوسن کو بیٹی کی گالی دی تھی اور اُس نے جل بھن کر کہہ دیا تھا "تیرا بیٹا کبوتر باز نکلے گا!" مجھے یہ خبر

ایک بڑھیا برہمنی سے ملی ہے۔ کون تھی وہ پڑوسن جس کی پیشین گوئی اتنی سچی نکلی؛ رانجھے کی ڈھیلی پگڑی دیکھتا ہوں، تو سوچتا ہوں کیا یہ بھی کسی بڑھیا کی بددُعا کا اثر ہے!

'میٹھا ہے تو اچھا!'— وہ کہہ رہا ہے۔ کبھی کبوتر کی چونچ کی طرف بغور دیکھتا ہے۔ کبھی اُس کا سینہ پکڑتا ہے اور پھر جب کبوتر پر پھڑپھڑاتا ہے تو اُس کی گردن سامنے کی طرف جھک جاتی ہے اور وہ اپنی آنکھیں کبوتر کی آنکھوں میں گاڑ دیتا ہے۔ کبوتر دیکھتا ہے کہ اس کے مالک کی آنکھوں میں پیار کا ہی نہیں، رحم کا بھی ایک بے کنار سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کبوتر دل ہی دل میں مست ہو اُٹھتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی لالی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ لال لال ڈوروں میں شفق کا سارا حُسن ناچنے لگتا ہے، اور اُس کی آنکھوں کی وہ سفیدی، جو دائرے میں کنارے کنارے نظر آتی ہے۔ اپنے اندر پہاڑی شہد کی سی شیرینی لئے رہتی ہے کبوتر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کیا وہ سونے چلا ہے اپنے مالک کے نرم ہاتھوں میں، جیسے دودھ پیتا بچہ ماں کی گود میں سو جاتا ہے۔

جب میں کسی کبوتر کے پاؤں میں زنجیر بندھی ہوئی دیکھتا ہوں تو مجھے آدمی کی بے رحمی پر بہت غصہ آتا ہے۔

حافظ کے ان الفاظ کو یاد کر کے جو اُس نے کعبہ کی چھت پر بیٹھے

کسی آزاد کبوتر کو مخاطب کر کے لکھے تھے، میرا دل تڑپ اٹھتا ہے:

"تو اے کبوتر بام حرم چہ می دانی

طپیدن دلِ مرغانِ رشتہ برپا را!

— اے حرم کی چھت پر بیٹھنے والے کبوتر! اُن پرندوں کے دل کے پھڑپھڑانے کو تو کیا جانے جن کے پاؤں میں رسّی بندھی ہوئی ہے!

سپنوں میں بھی جنگلی کبوتر کا خیال میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اِدھر جنگلی کبوتروں کی بھرمار ہے۔ باہر کھیتوں میں نکل جاتا ہوں تو شام کے گرد و غبار سے میلے بادلوں میں تیز رفتار سے اُڑنے والے کبوتر میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اُڑتے اُڑتے وہ اُفق میں غائب ہو جاتے ہیں، جہاں بادلوں کی سُرخی اُنہیں ڈھانپ لیتی ہے۔ کھیتوں سے لوٹتے ہوئے کسان اور مزدور شام کی پُرسکون فضا میں آزاد جنگلی کبوتروں کی پرواز دیکھ کر اپنی صدیوں سے چھنی ہوئی راحت کو واپس لانے کی جستجو میں کھو جاتے ہیں۔ . . . کتنے بے فکر ہیں یہ پرندے، وہ سوچتے ہیں — کسان مزدور سے کہیں زیادہ بے فکر!

کبھی کبھی کوئی شکاری بھی مل جاتا ہے، اور اُس کے پاس مرے ہُوئے جنگلی کبوتر دیکھ کر اُن کی بے بسی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ سوچتا ہوں ظالم کی بندوق چھین کر چکنا چُور کر دوں۔ وہ شکاری میری

زبردستی سے پکڑ کر اسی بندوق سے مجھے بھی کبوتر کی طرح موت کے گھاٹ اُتار دے، یہ ڈر کچھ نہیں کرنے دیتا۔

پالتو کبوتر غلام تو ہے مگر اُسے کسی شکاری کی بندوق اپنا نشانہ نہیں بناتی۔ وہ جنگلی کبوتر سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ پالتو کبوتروں کی شاہانہ بُردباری، خُود فراموشی اور پُرسکون طبیعت کے بالمقابل جنگلی کبوتروں کی لاپروائی پر میں جی جان سے قربان ہو سکتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی لاپروائی اُنہیں زیادہ عمر نہیں پانے دیتی۔

رانجھا کہتا ہے "اگر خدا مجھے کبوتر کا جنم دینے پر رضامند ہو جائے۔ تو میں "لکّا" کبوتر بننا پسند کروں۔" پالتو کبوتروں میں "لکّا" کی اپنی جگہ ہے وہ بہت اُڑتا نہیں مگر نفاست میں دوسرے کبوتروں پر بازی لے جاتا ہے۔ پر پھیلا کر اور گردن اکڑا کر وہ اپنے مالک کا من موہ لیتا ہے۔ گردن تو پیچھے کی طرف اس طرح موڑتا ہے کہ وہ پیٹھ کے پروں کو چھُوتی نظر آتی ہے۔

میں کہتا ہوں "خدا مجھے پرندہ بنا دینے پر رضامند ہو جائے تو بلاشُبہ میں جنگلی کبوتر کی چند روزہ آزاد زندگی پانا پسند کروں گا۔"

بیراگیوں کے ڈیرے میں، جو رانجھے کی جدّی جایداد ہے، پیپل کا ایک بوڑھا پیڑ کھڑا ہے۔ پاس ہی جاگیرداروں کی حویلی کے کھنڈر اپنی بربادی

وخستہ حالی کا افسانہ سنانے کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں۔ اس حویلی میں بیسیوں جنگلی کبُوتروں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں اور اس پیپل پر بھی بھُولے بھٹکے کبُوتر رین بسیرے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔

پالتو کبُوتروں کی کابکیں جنہیں رانجھے نے بڑی خُوبصورتی سے تیار کروایا ہے، زیادہ دُور نہیں، اِن کبُوتروں کے کئی رنگ ہیں۔ کوئی سفید ہے تو کوئی چتکبرا، کوئی مٹیالا ہے تو کوئی سیاہی مائل۔

مگر جنگلی کبُوتر خاکستری رنگ کے ہی ہوتے ہیں۔

۳

شروع میں شاید سبھی کبُوتر جنگلی تھے۔ شاید کیوں، ضرور۔

چرخہ کاتنے والی دوشیزہ اپنے محبُوب کی جادُو بھری نگاہوں میں جنگلی کبوتر کی سی حرکت دیکھ لیتی ہے۔ صدیوں سے گاؤں کی لڑکی اس تشبیہ میں بشاشت کی جھلک پیدا کرتی رہی ہے:

"جنگلی کبوتر نے

مینوں تنجن وِچ اکھ ماری!"

— میں چرخہ کاتنے والی لڑکیوں کی محفل میں چرخہ کات رہی تھی، جنگلی کبوتر نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا!'

جنگلی کبُوتر نے

میرے ہسدی دے دند گن لئے"

— جنگلی کبوتر نے میرے دانت گن لئے جبکہ میں ہنس رہی تھی!"

اور جب یہ کبوتر جانے لگتا ہے تو گاؤں کی لڑکی کہہ اٹھتی ہے:

"ایتھوں مار اُڈاری

کِدھر جاویں گا؟"

— یہاں سے اُڑ کر کہاں جائے گا تُو؟"

کبھی یہ کبوترا اپنے سسرال میں بھی جا نکلتا ہے:

"سس نوں ہوائی پچھے دا

کدوں بھیجنی کبوتری میری؟"

— ساس سے داماد پوچھ رہا ہے۔ میری کبوتری کو (میرے ہمراہ) کب بھیجو گی؟"

بچپن کی سہیلیاں دُلھن کو چھیڑتی ہیں:

"دھئیے بدام رنگئے

تینوں لین کبوتر آیا"

— او بادام کی ہم رنگ دھئی! تجھے لینے کے لئے کبوتر یہاں آنکلا ہے"

یہ حق ہے کہ جنگلی کبوتر جلد ہاتھ نہیں آتے۔ اسی لئے وہ "گولے"

کہلاتے ہیں ـــ نٹ کھٹ! اور اُن کے بالمقابل پالتو کبُوتر "بیبے" کہلاتے ہیں ـــ اچھے!:

"ایہہ جنگلی کبوتر گولے
تاڑی ماریاں اُڈّ جاندے!"

ـــ 'بڑے نٹ کھٹ ہیں یہ جنگلی کبوتر، ہاتھ سے تالی مارتے ہی وُہ اُڑ جاتے ہیں!'

بھاوج اپنی نند کا راز کھول دیتی ہے۔

"موہ لیا کبوتر گولا
نند کواری نے!"

ـــ 'میری کنواری نند نے نٹ کھٹ کبوتر کا من موہ لیا!'

اور نند خود اپنے کبُوتر کی تعریف کے پُل باندھنے لگتی ہے:

"ردہی دا کبُوتر گولا
دُھپ وِچ چھاں مِن دا!"

ـــ 'بنجر علاقے کا شریر کبُوتر دھوپ میں چھاؤں ماپتا ہے'۔

گاؤں کی لڑکی خود بھی کسی کبوتری سے کم نہیں:

"پچھی اُڈّ گئی کبوتری بن کے
ہریاں کنکاں چوں!"

—— گیہوں کے سرسبز کھیتوں میں سے لچھی کبوتری بن کر اُڑ گئی!'

گیہوں کی بالیاں لچھی کی پریم کہانی سنا سکتی ہیں۔ کھیتوں کی رومانی کیفیت نے بار بار دیہاتی شاعری کو گدگدایا ہے۔ گیہوں کے کھیت آج بھی پیار اور خوشی سے لہلہا رہے ہیں۔

مرد عورت کا ملاپ، پیار کا جذبہ، حُسن کی کھوج، کالی مدھ ماتی آنکھوں کی ہیرا پھیری، جوانی کی شوخی اور زندہ دلی —— ایسے نظّارے دیہاتی کہانیوں اور گیتوں میں ہمیشہ مقبول ہوئے ہیں۔

کِسان کی بیٹی، جس نے اپنا گندمی رنگ شاید اپنے باپ کے کھیتوں کے گیہوں سے حاصل کیا ہے، اور جس کے گال آسمان کے آزاد کبوتر کو کھینچ لینے کا دم رکھتے ہیں، دھرتی کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ صدیوں سے وہ گاتی آئی ہے:

"باری وِچ بیٹھی ہوئی دی
چُمّی لے گیا کبوتر بن کے"

—— 'میں کھڑکی میں بیٹھی تھی، اس نے کبوتر بن کر میرا مُنہ چوم لیا!'

ایک جرمن کہاوت ہے "میں بوسہ بازی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جبکہ میں خود اس میں حصّہ نہیں لے رہی ہوتی" —— کیا ہماری یہ کسان لڑکی بھی اپنے کبوتر کا مُنہ چوم لینا چاہتی ہے؟

اٹلی کی لڑکی اپنی پرانی کہاوت میں کہتی ہے" مجھے چوم لے، پوپ تجھے معاف کر دے گا؟ مجھے چومو اور میں بھی تمہیں چوموں گی، اور پوپ ہم دونوں کو معاف کر دے گا!" ہماری یہ کسان لڑکی اس سلسلے میں کیا جذبہ پیش کرنا چاہتی ہے؟

ہاں، مجھے یاد ہے وہ گیت جس نے حال ہی میں جنم لیا ہے، اور کھیتوں میں بڑے شوق سے گایا جاتا ہے:

" اج دے شوقین منڈے

کھنڈ بھک کے باگیاں لیندے!"

— آج کل کے شوقین نوجوان (محبوبہ کے رخساروں پر) کھانڈ لگا کر بوسے لیا کرتے ہیں!'

طنز نے اپنی حد کو چھو لیا ہے۔ از خود بوسہ بازی میں آج کے لڑکے کچھ مٹھاس نہیں پاتے! کون جانے گاؤں کے اس کبوتر کو بھی، جو کھڑکی میں بیٹھی کسان لڑکی کا بوسہ لے گیا، کچھ مٹھاس معلوم ہوئی یا نہیں۔ اُسے شاید ابھی تک محبوبہ کے رخساروں پر کھانڈ لگانے کی ضرورت نہیں پڑی!

رانجھا بیراگی کبوتر اُڑاتا اُڑاتا خود ایک کبوتر نہیں بن گیا، یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ اپنی سب سے خوبصورت کبوتری کو جو اب پانچ بچوں کی ماں ہے، وہ ہیر کہہ کر اپنا جنسی لطف کچھ کچھ پورا کر لیتا ہے۔ اور وہ

گنگناتا ہے :

"تیری ہک تے آہلنا پایا
جنگلی کبوتر نے !"

— تیرے سینے پر جنگلی کبوتر نے گھونسلا بنا لیا ہے !'

یہ جنگلی کبوتر ہے یا خود کام دیوتا ؟ — رانجھا بیراگی بھی سوچ رہا ہے۔
ادھر جنگلی کبوتروں کی بھرمار ہے۔ باہر کھیتوں میں نکل جاتا ہوں تو شام کے گردو غبار سے میلے بادلوں میں تیز رفتار سے اڑنے والے کبوتر میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ کھیتوں سے لوٹتے ہوئے کسان اور مزدور شام کی پُرسکون فضا میں آزاد پنچھیوں کی پرواز دیکھ کر اپنی صدیوں سے چھنی ہوئی راحت کو واپس لانے کی جستجو میں کھو جاتے ہیں۔
جنگلی کبوتر کی طرح جو آسمان کی وسعتوں کا دورہ کرنے کے بعد پھر دھرتی پر اُترتا ہے میں بار بار یہاں چلا آتا ہوں۔ یہ ساری دھرتی مجھے جانتی ہے۔ یہاں میں نے جنم لیا۔ میرے سپنوں میں جو درجہ اسے حاصل ہے وہ کسی دوسرے کا حق نہیں ہوسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ گاؤں ہمیشہ کے لئے مجھے جکڑ نہیں سکتا۔
غربت بھی ہے اور افسردگی بھی۔ مگر دل کو خوش کرنے والے گیت بھی تو ہیں —
تھکن اُتار دینے والے، ڈانواڈول روحوں کو خود فراموشی کے عالم میں لے جانے والے۔
یہ گیت ماضی کے بیٹے ہیں اور مستقبل کے امانت دار۔ سُنے جاؤ اور گائے جاؤ اپنے گیت پُرانے اور نئے، دھرتی کے بیٹو!